ذرا انگلستان تک

علی سفیان آفاقی

1996ء

اہتمام

ڈاکٹر ظفر مقبول

مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور

قیمت -/ 120 روپے

پرنٹرز: معظم پرنٹرز۔ لاہور

فہرست

جاوید نقاش پیرزادہ

ذرا انگلستان تک

دُنیا کو دیکھنے کا شوق ہمیں ہوش سنبھالتے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ بچپن میں جب کوئی پوچھتا "بیٹے۔ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

تو جواب میں کہتے۔ "سیّاح"

کچھ اور عقل آئی تو شوق میں بھی اضافہ ہو گیا۔ محفلوں میں جب سب لوگ پامسٹ کو ہاتھ دکھانے کے بعد اس سے اپنی عمر، صحت اور دولت کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ ہمارا پہلا سوال یہ ہوتا تھا۔

"کیا میرے ہاتھ میں باہر کے سفر کی لکیر ہے؟"

قدرت کو بھی ہمارے شوق کی تکمیل مقصود تھی۔ چنانچہ نو دس برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے ہم نے سفر شروع کر دیئے۔ ۱۹۷۰ء تک ہندوستان اور پاکستان میں کافی سیر و سیاحت کی۔ پاکستان کے قریب قریب تمام صوبوں کا پھیرا لگایا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کی بھی سیر کر لی۔ سفر کی خواہش تو پوری ہو رہی تھی مگر "سمندر پار" کے سفر کی حسرت ہی تھی۔ سو وہ بھی ۱۹۷۰ء میں پوری ہو گئی۔ بیرونِ ملک ہم نے پہلا سفر انگلستان کا کیا۔ اور وہ بھی براستہ یورپ، یعنی چُپڑی اور دو دو۔ وہ سارے شہر جنھیں اِس سے پہلے ہم نقشے پر اور فضائی کمپنیوں کے اشتہاروں میں دیکھا کرتے تھے اب بنفسِ نفیس

وہاں جانے کی نوبت آرہی تھی۔ لندن۔ روم۔ پیرس۔ جینوا۔ فرینکفرٹ۔ بیروت۔ پہلے ہی سفر میں ان تمام شہروں کا دیدار ہونے والا تھا۔ ہمیں اس وقت تک یقین نہیں آیا جب تک ہم کراچی سے پین ایم کے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر پرواز نہیں کر گئے۔

مگر اس سے پہلے یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ سفر کس سلسلہ میں تھا؟ دو پاکستانی فلم ساز بیک وقت یورپ میں اپنی فلموں کی شوٹنگ کرنے جا رہے تھے اور اتفاق سے دونوں کے مصنّف ہم تھے۔ فلم ساز راشد مختار کی فلم "میرے ہم سفر" کی فلم بندی لندن اور یورپ کے مختلف شہروں میں ہونے والی تھی جب کہ فلم ساز و اداکار اعجاز درّانی کی فلم "دوستی" کی شوٹنگ کے لیے لندن کو مرکز بنایا گیا تھا۔ "دوستی" ان پاکستانیوں کی کہانی ہے جو روپیہ کمانے کے شوق میں باہر جاتے ہیں مگر وہاں عام تصوّرات کے برعکس نہایت کٹھن حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ جو لوگ وہاں خوش قسمتی سے دولت مند ہو بھی جاتے ہیں وہ مختلف ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولاد مشرق اور مغرب کے درمیان معلّق ہو کر رہ جاتی ہے۔ مغرب والے انھیں مشرقی سمجھ کر ناپسند کرتے ہیں اور مشرق میں انھیں مغرب زدہ قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس اہم موضوع پر بنائی جانے والی اس فلم میں انگلستان میں رہنے والوں کی حقیقی زندگی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ تو ہم نے سُنی سُنائی اور کچھ وہاں جا کر رہنے والوں کے تاثرات سے اخذ کیا اور کچھ کتابی معلومات کا سہارا لیا۔ لیکن وہاں کے طرزِ زندگی کو پیش کرنے کے لیے وہاں جا کر بذاتِ خود مشاہدہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی مقصد سے ہم فلم یونٹ کے ساتھ جا رہے تھے۔

لیکن "دوستی" سے پہلے "میرے ہم سفر" کی فلم بندی کا آغاز ہونا تھا۔ کہاں ہونا تھا؟ یہ خدا بہتر جانتا تھا یا فلم ساز راشد مختار، ہدایت کار پرویز ملک اور عکّاس سہیل ہاشمی مناسب جگہیں تلاش کرنے کے لیے ایک مہینے پہلے ہی رُخصت ہو گئے تھے اور یورپ کے

شہر چھان رہے تھے۔ اب فلم کے یونٹ کو روانہ ہونا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ فلم بندی کا آغاز روم سے ہوگا۔ اگلی منزل کے بارے میں فیصلہ زیرِ غور تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یونٹ کے دو ارکان ہمارے ساتھ پین ایم کی فلائیٹ میں سفر کریں گے جبکہ باقی ماندہ یونٹ دو دن بعد پی۔ آئی۔ اے کی پرواز سے روم پہنچے گا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ہمارے ہم عمر یار خاں تھے اور دوسرے ہم سے کم عمر منوّر تھے لیکن ہمیں ان دونوں کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ ان میں سے ایک صاحب تو محض "یس" اور "نو" کی حد تک انگریزی جانتے تھے۔ یار خاں تعلیم یافتہ تھے مگر انھیں انگریزی کی مشق کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے بقول ان کے ان کی انگریزی میں "روانگی" نہیں تھی۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ہماری خدمات بطورِ مترجّم حاصل کر لی تھیں۔ وہ اس خیال سے زیادہ بوکھلاتے ہوتے تھے کہ انھیں پین امریکن ائر ویز سے سفر کرنا تھا۔ "یار یہ کم بخت امریکن تو انگریزوں کی انگریزی کی بھی گردن مروڑ دیتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھ جاتے ہیں؟" انھوں نے شکوہ کیا۔

"اچھی بھلی انگریزی بولتے ہیں" ہم نے کہا۔

بولے!

"خاک اچھی بولتے ہیں۔ ناک میں بولتے ہیں۔ ہر لفظ میں نُون غُنّہ ضرور لگاتے ہیں اور لفظوں کو یوں لٹا دیتے ہیں جیسے استری کر دی ہو اور پھر وہاں تو ائر ہوسٹسیں بھی امریکن ہوں گی۔ سُنا ہے مسافر بھی زیادہ تر یورپین اور امریکن ہوتے ہیں۔ یار میرا تو دم گھُٹ جائے گا۔"

ہم نے انھیں دلاسہ دیا اور تربیت کے پہلے سبق کے طور پر اپنے ساتھ پین امریکن کے دفتر لے گئے جہاں بیشتر عملہ پاکستانی تھا۔ انھوں نے وہاں بھی اُردو اور پنجابی بولنی شروع کر دی۔

"انگریزی بولو۔ ورنہ "روانگی" کیسے پیدا ہوگی" ہم نے چپکے سے انھیں ٹوکا، کہنے لگے:۔

"یار یہ تو پاکستانی لوگ ہیں۔ ان کے سامنے انگریزی بولوں گا تو غلطیاں نکالیں گے۔ امریکیوں کی تو سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ کیا بول رہا ہوں۔ اس لیے جہاز میں جاکر انگریزی بولیں گے۔"

اس اثنا میں ایک خاتون نے ریٹرن ٹکٹ ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔ ہم پر ایک عجیب سرخوشی کا عالم طاری تھا اور کانوں میں اپنے اُستاد قاضی کی آواز گونج رہی تھی جو ہمیں دسویں جماعت میں پڑھایا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے کہا تھا۔

"قاضی جی۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ دُنیا کا کونہ کونہ دیکھیں۔"

قاضی جی بولے۔

"میرے عزیز۔ تمھاری یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ کیونکہ دُنیا کے کونے نہیں ہوتے، دُنیا گول ہے۔ البتہ تم گھوم پھر کر دُنیا کی گولائیاں دیکھ سکتے ہو۔"

اور دُنیا کی گولائیاں دیکھنے کے لیے ہم پین ایم کی فلائیٹ میں سوار ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بیرونِ مُلک، خصوصاً یورپ کا سفر ہر کوئی نہیں کرتا تھا اور زرمبادلہ حاصل کرنا تو جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ہمارے حصّے کا زرمبادلہ فلم ساز راشد مختار صاحب کے پاس تھا اور ہم محض خالی ہاتھ سفر کر رہے تھے۔ ہر پاکستانی اپنے ساتھ بیس پاکستانی روپے لے جاسکتا تھا جو ہم نے اپنے پرس میں رکھ لیے تھے۔ ہم شریف اور ڈرپوک آدمی ہیں اس لیے غیر قانونی طور پر زرمبادلہ ساتھ لے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر اداکارہ شبنم کے شوہر روبن گھوش نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ وقت بے وقت کے لیے تھوڑے بہت ڈالر اپنے ساتھ ضرور رکھ لینا ورنہ مشکل میں پڑجاؤگے

ہمارے انکار پر انھوں نے بیس ڈالر کا نوٹ چلتے چلتے ہمارے کوٹ کے استر میں رکھ دیا اور بولے۔

"یہ بیس ڈالر لندن میں واپس لے لوں گا۔"

اِس طرح ہم تین مسافر مبلغ ساٹھ روپے پاکستانی اور بیس ڈالر امریکی ساتھ لے کر یہ لمبا سفر کر رہے تھے۔ ڈالر کے نوٹ کی ہم نے ساتھیوں کو ہَوا بھی نہیں لگنے دی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وہ راستے میں اپنی فرمائشوں سے ناک میں دم کر دیں گے اور بیس ڈالر روم پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔

پین ایم کی فلائیٹ بے حد امریکن اور انتہائی مزیدار ثابت ہوئی۔ مسافر بیشتر گورے تھے، ماحول انتہائی رومانی اور کیف آور تھا اور یار خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دیکھیں اور کیا نہ دیکھیں۔ خود ہمارا یہ بیرونِ مُلک پہلا سفر تھا اور وہ بھی امریکی ائر لائن کے ذریعے۔ ہمارے دونوں ساتھی بالکل ہی اناڑی تھے۔ منوّر نے تو اس سے پہلے ہوائی جہاز میں سفر کیا ہی نہیں تھا اور پہلی بار جہاز میں بیٹھا تھا اِس لیے سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ اکثر وہ ائر ہوسٹس کو "سسٹر" کہہ کر مخاطب کرنے کی کوشش کرتا رہا جو ظاہر ہے اس نے نہیں سُنا۔

یار خاں نے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد لمبی تڑنگی امریکن ائر ہوسٹسوں کے بارے میں اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اُردو اور پنجابی میں زور شور سے تبصرہ کیا بلکہ حالات اور موقع کے لحاظ سے کچھ شعر بھی پڑھے۔ اس کے بعد ان کی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فواکہات، مشروبات، سگریٹ، ماچس، پانی غرضیکہ انھیں ہر چیز کی ضرورت پڑ رہی تھی جو ہمارے توسط سے فضائی میزبان تک پہنچائی جاتی تھی۔ یار خاں کو جو چیز پسند آتی وہ فوراً کہتے کہ انگریزی میں "انھیں" بتا دو۔ جب ہم ان کی بات نہ مانتے تو کہتے "یار" جیلس ہوگئے نا؟

مگر پہلا مرحلہ اس وقت پیش آیا جب ناشتے میں فرائیڈ انڈوں کے ساتھ ہمیں انتہائی خوشنما گوشت کے پارچے پیش کیے گئے۔ چھری کانٹے کی مدد سے کاٹا تو اندر سے انتہائی نفیس سُرخی مائل گوشت نمودار ہوا۔ ہم نے کہا۔

"خاں صاحب۔ گوشت کا رنگ دیکھ رہے ہو؟"

مُسکرا کر بولے۔

"اجی کیا بات ہے امریکنوں کی۔ کتنا عمدہ گوشت ہے۔ ایک ہمارے مُلک کا گوشت ہوتا ہے۔" انھوں نے گلابی گوشت کو اپنے کانٹے میں پروتے ہوتے داد طلب نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔

"مگر یہ اِتنا سُرخ کیوں ہے؟"

"یار تم نے دیکھا نہیں۔ امریکن کتنے سُرخ سفید ہوتے ہیں۔ اب ذرا سامنے جانے والی ائیر ہوسٹس کی پنڈلیاں دیکھو۔ ہے کوئی مقابلہ؟"

"یار خاں!"

"ہم نے خوفزدہ ہو کر کہا۔"

"ہمارا خیال ہے یہ حرام گوشت ہے۔ پہلے اس کی تصدیق کرنی چاہیئے۔"

یہ کہہ کر ہم نے برابر سے موجِ صرصر کی مانند گزرتی ہوئی ائیر ہوسٹس کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پوچھا۔

"سنیئے۔ کیا یہ ہیم ہے؟"

"آف کورس۔"

اُس نے مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوتے جواب دیا اور تیزی سے آگے نکل گئی۔

خان صاحب کا کانٹا نصف راستے میں معلق رہ گیا۔ پھر انھوں نے لاحول پڑھتے

ہوتے گوشت کے پارچے کو واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ منوّر نے بھی ان کی تقلید کی۔ ہم نے ائیر ہوسٹس کو مطلع کیا کہ ہم مسلمان ہیں اور سور کا گوشت حرام سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے دوسرا ناشتہ لاؤ۔ مزید زور دینے کے لیے خاں صاحب نے بھی انگریزی کی ٹانگ توڑنی شروع کر دی۔

"وِی مُسلم یو نو؟ ہیم از"—

وہ حرام کے لیے مناسب انگریزی لفظ تلاش کرنے لگے۔

"یار وہ انگریزی میں کیا ہوتا ہے "حرام"؟"

ہوسٹس جلدی میں تھی۔ اس نے صرف مُسکرانے پر اکتفا کیا اور چلی گئی مگر واپسی میں اس نے ہمیں سرزنش کی کہ آپ نے یہ معلومات ٹکٹ حاصل کرتے ہوئے کیوں نہیں لکھوائی تھیں۔ ہمارے پاس تو ہدایات کے مطابق ناشتہ ہوتا ہے۔ اب آپ اِنتظار کیجیے۔ مَیں کوئی بندوبست کرتی ہوں۔

بندوبست کرتے کرتے اُس نے اتنی دیر کر دی کہ ہمارے آس پاس والوں نے اپنا ناشتہ ختم کر کے ڈکاریں لینی شروع کر دیں۔ خدا خدا کر کے اُس کی من موہنی صورت دوبارہ دکھائی دی۔ اس نے ایک باسکٹ اور ایک ٹرے ہمارے سامنے لا کر رکھ دی جو انواع و اقسام کے بسکٹوں، پنیر، ٹوسٹ، مکھن، پھلوں وغیرہ سے بھری ہوئی تھی۔ معذرت کے انداز میں بولی۔

"معاف کرنا۔ جو دال دلیہ میسّر ہوا وہ حاضر ہے۔ آئندہ کبھی ہدایات کے بغیر سفر نہ کرنا۔ یو مسلم!"

اور غائب ہو گئی۔ ناشتے کا سامان اتنا زیادہ تھا کہ خان صاحب نے بچا کھچا اپنے بیگ میں ٹھونس لیا اور ہمارے ٹوکنے پر بولے

"یار آخر ہم نے بھی ٹکٹ خریدا ہے۔ یہ سامان ضرورت کے وقت کام آتے

گا۔ وہ کون سا ہم سے حساب لے گی۔" بعد میں ان کی ہر بات سولہ آنے درست نکلی۔ کیونکہ جب ہم نے راستے میں بیروت میں ساڑھے چھ گھنٹے قیام کیا تو یار خاں کے سنبھال کر رکھے ہوئے بسکٹ، پنیر اور مکھن بہت کام آیا۔

بیروت کی رونقیں اُس زمانے میں پورے عروج پر تھیں۔ ہمارے لیے تو یوں بھی ہر چیز نئی اور انوکھی تھی۔ پہلی بار پاکستان سے باہر قدم رکھا تھا اور ہر بین الاقوامی معیار کی چیز ہمیں حیرت میں ڈال رہی تھی۔ چنانچہ یہی واقعہ بیروت میں بھی رونما ہُوا۔ کراچی اور بیروت کے ائرپورٹ کا بھلا کیا مقابلہ؟ وہ انتہائی صاف شفاف، خوبصورت بے حد ماڈرن۔ ہر چیز مغربی ساخت اور وضع کی۔ عمارت بے حد عالیشان اور کشادہ۔ دُنیا بھر کے مسافروں کی ریل پیل، چہل پہل ایسی کہ ہمارا جی چاہا وہیں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں۔ عملے کے لوگ بہت اخلاق اور مہذب۔ یہ ہمارا کسی بیرونی ائرپورٹ کو دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا اور وہاں اتنی بڑی تعداد میں عملے اور مسافروں میں خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ان کی صورت شکل، ناک، نقشہ، عادات و اطوار، اندازِ گفتگو، نشست و برخاست کا طریقہ، سبھی کچھ ہمارے لیے نیا تھا۔ ان کی دلآویز مسکراہٹ اور چمکتی سیاہ آنکھیں، دمکتے ہوئے سُرخ و سفید چہرے اور پھر اس پر مستزاد مغربی لباس اور طور طریقے۔ ہم تینوں تو بس دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے آئینہ خانے میں پینڈو چلے آتے ہیں۔

بیروت میں ہمارا قیام ساڑھے چھ گھنٹے کا تھا۔ کچھ دیر تو ہم اِدھر اُدھر ٹہلتے اور نظاروں سے لُطف اندوز ہوتے رہے مگر پھر بھوک نے ستایا۔ یار خاں کو چائے کی طلب بے تاب کئے دے رہی تھی۔ کرنسی ہمارے پاس تھی نہیں کیونکہ پچاس ڈالر کا نوٹ ہم نے بہت احتیاط سے چھپا رکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ مگر جب چائے کی خواہش نے بہت ستایا تو ہم ٹہلتے ہوئے ریسٹورینٹ

میں چلے گئے۔ ایک مہ جبیں مُسکراتی ہوئی ہماری طرف آئیں اور انگریزی میں پُوچھنے لگیں۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" کاش ہم ان سے کوئی خدمت کرانے کے قابل ہوتے۔ پھر بھی چائے کے ایک کپ کی قیمت دریافت کر لی جو انھوں نے ڈالروں میں بتائی۔ ہم نے لجاجت سے پوچھا۔

"پاکستانی کرنسی چلے گی؟"

انھوں نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔

"سوری۔ اونلی امریکن ڈالرز۔"

ہم لوٹ آئے اور یار خان کو مشن کی ناکامی سے آگاہ کر دیا۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ عربوں کو بہت دیر تک بُرا بھلا کہتے رہے کہ دیکھئے۔ اپنے دوست اسلامی ملک کی کرنسی کی کچھ قدر ہی نہیں کرتے۔ یہ کہاں کا اخلاق اور بھائی چارہ ہے؟ ہم دوبارہ ائرپورٹ کی رونقیں دیکھنے میں مصروف ہو چکے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر بعد چائے وائے کو بھُول کر نظارہ بازی میں ایسے محو ہوئے کہ اپنے ساتھیوں کی جانب سے مطلق بے خبر ہو گئے۔ اس اثنا میں یار خاں ایک بُک سٹال پر پہنچ کر خالص دیسی عادات کے مطابق میگزین اور کتابیں دیکھنے بلکہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں وہ سب میگزین اور کتابیں نظر آئیں جن کا تذکرہ بھی ہمارے ملک میں ممنوع تھا۔ فوراً بھاگے بھاگے ہمارے پاس آئے اور پھُولی ہوتی سانسوں سے بتایا کہ یار۔ یہ لوگ تو بہت بے شرم ہو گئے ہیں۔ کیسی کیسی واہیات کتابیں اور میگزین کھُلے عام رکھ چھوڑے ہیں۔ یہ اطلاع دے کر وہ دوبارہ بُک سٹال پر پہنچ گئے۔ مگر افسوس کہ میگزینوں کے صفحے اُلٹ کر نہیں دیکھ سکے کیونکہ دوکاندار نے ان جیسے شوقین اور مفت خور گاہکوں سے بچانے کے لیے انھیں پلاسٹک کے بند کور میں رکھ چھوڑا تھا۔ مگر "بیہودہ کتابیں" البتہ کھُلی رکھی تھیں۔ وہ کھڑے کھڑے دو تین کتابیں تو

پڑھ گئے۔ وہ اس طرح کہ ہر کتاب کے چند صفحے پڑھتے اور پھر مارے ہو کے دوسری کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے۔ دوکاندار ایک طرحدار خاتون تھیں۔ کچھ دیر تو انھوں نے صبر کیا مگر پھر ان سے رہا نہ گیا اور وہ یار خاں سے مخاطب ہوئیں۔

"ایکسکیوزمی۔ کیا آپ یہ کتاب خریدیں گے؟"

یہ بوکھلا کر بولے۔

"جی۔ ابھی تو ورق گردانی کر رہا ہوں۔"

انھوں نے دستِ حنائی بڑھا کر کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی اور بولیں۔

"معاف کیجیے۔ یہ کتابیں صرف خریدنے کے لیے ہیں۔ ورق گردانی کے لیے نہیں۔"

یار خاں ہمارے پاس واپس آئے تو غصے کے مارے ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک عربوں کی اخلاقی پستی کا ماتم کرتے رہے۔

"اِس قدر فضول کتابیں اور یوں کُھلے عام رکھ چھوڑی ہیں۔ عورتیں۔ بچّے بڑے بوڑھے سبھی دیکھ رہے ہیں۔ یار ان کو ذرا بھی شرم نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک جوان عورت یہ خرافات فروخت کر رہی ہے۔ کتنے شرم کا مقام ہے۔ ان لوگوں پر ضرور کوئی عذاب نازل ہو گا۔"

عذاب تو کچھ عرصے بعد واقعی بیروت پر نازل ہوا۔ مگر وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ یار خاں کی بددعا کی بدولت تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ مگر انھوں نے "آثارِ قیامت" صاف طور پر دیکھ لیے تھے۔ اس کے بعد واپسی میں بھی ہم بیروت میں مقیم ہوتے اور بقول یار خاں "قیامت کی نشانیاں" دیکھیں۔ بیروت اُس زمانے میں مشرق کا پیرس کہلاتا تھا۔ واپسی میں ہم کیونکہ پیرس بھی دیکھ آتے تھے اِس لیے اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ محض عربوں کی کسرِ نفسی تھی یا پیرس کی گڈوِل سے فائدہ اُٹھانے کی خواہش، ورنہ بیروت

ہر لحاظ سے پیرس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ جمال کی رعنائیاں، عیش و طرب کی آسانیاں شراب و شباب کی شوخیاں اور فراوانیاں، نائٹ کلبوں کی رونقیں، قمار خانوں کی محفلیں، ہوٹلوں، ساحلوں اور ریسٹورانوں کی دلکشی، غرضیکہ یہ شہر مرکزِ رعنائی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے دُنیا بھر کا حسن و جمال سمٹ کر اِس چھوٹے سے شہر کے دامن میں سما گیا ہے، قدرت اور انسان کی صنّاعیوں کا مُرقّع، اس کا ہر انداز دیوانہ کر دینے والا تھا۔ پھر یہ دیکھا کہ سوئمنگ پُول میں جل پریاں محوِ غسل ہیں اور کنارے پر باریش، جُبّہ پوش، نورانی چہروں والے بزرگ فروکش ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح، سامنے شراب کا گلاس، منہ ہی منہ میں خدا جانے کیا پڑھتے رہتے تھے لیکن نگاہیں کہیں اور مصروفِ خرام ہوا کرتی تھیں۔

خیر، یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ تذکرہ تھا بیروت ایئر پورٹ کا۔ ہماری چلنے کی خواہش میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا مگر اس کے حصُول کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم بھی گھوم پھر کر تھک گئے تھے اور ایک جانب آرام دہ صوفوں پر نیم دراز شفّاف شیشوں کے پیچھے بیروت ایئر پورٹ کے آس پاس کی پہاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک سُرخ و سفید، خوش جمال سیکورٹی گارڈ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مُسکرا کر پوچھا "ہندی؟" ہم نے پُرزور تردید کی اور بتایا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ نہایت گرمجوشی سے ہم سب سے معانقہ کیا اور ۱۹۶۵ء میں پاکستانیوں کی سرفروشی اور بہادری کے واقعات کی بہت تعریف کی۔ کافی دیر تک پاکستان کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لاہور پاکستان میں ہے۔ وہ اسے ہندوستان کا شہر سمجھ رہا تھا۔ یار خان اُس کی لاعلمی پر بہت برہم ہوتے، بولے۔

"یار چھوڑو۔ اِس سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ اِسے تو ہمارے مُلک کا جغرافیہ بھی معلوم نہیں ہے۔"

ہم نے تسلّی دی۔ "خاں صاحب۔ لگتا ہے جغرافیے اور تاریخ میں کمزور ہے بے چارہ۔"

"ویسے تو خُوب ہٹا کٹا اور صحت مند ہے۔" وہ جل کر بولے۔

سیکورٹی گارڈ اتنی دیر میں عربی نما انگریزی میں ہمیں بیروت کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا تھا۔ یکایک کچھ سوچ کر یار خاں کا چہرہ دمکنے لگا۔ بولے۔

"یار یہ تو اب ہمارا بہت دوست بن گیا ہے نا۔ یہ ہمیں ضرور چائے کی دعوت دے گا۔"

مگر اس خدا کے بندے نے تو کسی بھی قسم کی خاطر تواضع کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کافی دیر تک ہمارا دماغ کھانے کے بعد وہ "اللہ حافظ" کہہ کر رخصت ہو گیا اور یار خاں کے لیے ایک اور موضوعِ گفتگو چھوڑ گیا۔ خدا خدا کر کے ہماری فلائیٹ کا اعلان ہُوا اور ہم نے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی چائے کی فرمائش کر دی۔ خاں صاحب نے بچے کھچے بسکٹ وغیرہ نکالے اور ایئر ہوسٹس کی نظر بچا کر ہمیں پیش کیے۔ کہنے لگے۔

"مُنہ چُھپا کر کھانا۔"

"مگر کیوں؟" ہم نے پوچھا۔

"کوئی چوری ہے؟"

کہنے لگے۔ "یار پتہ نہیں کیا سوچے گی۔ میں خوبصورت لڑکیوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔"

مگر اُس غریب کے پاس سوچنا تو کیا ہماری طرف دیکھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد کھانا پیش کیا گیا اور اتفاق سے ہمیں "کوشر فوڈ" مل گیا۔ اُس وقت تک مسلمانوں نے اتنی زیادہ تعداد میں سفر کرنے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا اِس لیے

"مُسلم کھانے" کے نام کی کوئی چیز ہوائی جہازوں میں دستیاب نہیں تھی۔ البتہ یہودیوں کے لیے "کوشر میل" ضرور موجود ہوتا تھا۔ اِسی سفر میں ہمیں پہلی بار یہ بات معلوم ہُوئی کہ یہودی کسی قیمت پر بھی سور کے گوشت کو چھونا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ دُنیا بھر میں ان کے لیے "کوشر میل" کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ کھانا نہ صرف خنزیر کے گوشت سے محفوظ ہوتا ہے بلکہ باقاعدہ ذبیحے کا گوشت ہوتا ہے۔ اور ہر کھانے پر یہودیوں کے مربّی (پادری) کی مہرِ تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ اللہ اللہ کیا ٹھاٹ ہیں؟ ہم نے سوچا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ جب عربوں اور مسلمانوں نے سیر و سیاحت اور دُنیا کو زیر و زبر کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو "مسلم میل" بھی دستیاب ہونے لگا۔ بلکہ کچھ سال بعد تو ہم نے انگلستان کے بڑے بڑے سٹوروں اور ریسٹورانوں میں عربی میں ہدایات اور اشتہار بھی لکھے دیکھ لیے۔ دراصل عربوں کی دولت مندی کے آگے سبھی نے آنکھیں بچھا دی ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہی اہتمام جاپانیوں کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آیا۔ جب سے جاپانیوں کے پاس دولت کی ریل پیل ہوئی ہے اور انھوں نے ڈالر لٹانے شروع کیے ہیں یورپ کے لوگ امریکی دولت مندوں کی کہانیاں بھُول گئے ہیں اور جاپانیوں کی آؤ بھگت میں لگ گئے ہیں۔ دراصل یہ تو سوداگروں اور دوکانداروں کی اقوام ہیں۔ خاص طور پر انگریز۔ انھیں تو بس منافع کمانے سے غرض ہے۔ خواہ وہ عربوں کی خدمت کر کے حاصل ہو یا جاپانیوں کی چاپلوسی سے ملے۔

بیروت سے ایک جامع زیب عرب نوجوان بھی ہمارا ہم سفر ہوا۔ وہ لندن جا رہا تھا جب کہ ہماری منزل روم تھی۔ نام اُس نے طارق بتایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم آپس میں گھُل مل گئے۔ کچھ دیر بعد جب اس نے ایئر ہوسٹس سے شراب طلب کی تو یار خاں نے ہمیں کُہنی ماری اور سرگوشی میں بولے۔

"یار یہ کیسا مسلمان ہے، کم بخت شراب پیئے گا۔ اور وہ بھی دن دہاڑے؟! کھُلے

بندوں ؟" غالباً زیادہ اعتراض انھیں دن دہاڑے اور کھلے بندوں پینے پر تھا۔ ہم نے طارق سے پوچھا۔

"تمھارے نام سے تو لگتا ہے کہ تم مسلمان ہو۔"

گرمجوشی سے بولا۔

"الحمداللہ۔"

ہم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"مگر یہ شراب ۔ ۔ ۔ ؟"

وہ ہنسنے لگا۔ ایک گھونٹ بھرا اور کہنے لگا۔

"تھوڑی بہت پینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے نہیں۔ اسلام میں شراب حرام نہیں ہے، نشہ حرام ہے۔ اور مَیں کبھی مدہوش نہیں ہوتا۔"

لیجئے۔ قصہ ہی ختم ہو گیا۔ یارخاں تو آگ بگولا ہو گئے۔ پنجابی میں کہنے لگے۔

"اسے ہٹا دیجئے میرے سامنے سے۔ ورنہ ایمان سے مار بیٹھوں گا۔"

ہم نے انھیں سمجھایا۔

"زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پین ایم کا ہوائی جہاز ہے۔ آپ کا ڈرائنگ روم یا بیٹھک نہیں ہے اور وہ بھی مسافر ہے۔"

کہنے لگے۔

"یہ تو اسلام میں بھی مداخلت کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے ؟"

طارق نے مُسکرا کر یارخاں کو دیکھا اور ایک آنکھ میچ کر کہنے لگا۔

"پیوگے ؟ ایک گھونٹ تو لے کر دیکھو، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

یارخاں دھاڑ کر بولے۔

"بکواس بند کرو۔ شکر کرو کہ تم اس وقت ہوائی جہاز میں بیٹھے ہو اور

مَیں مسافرت کے عالم میں ہوں ورنہ تمھارا پیٹ پھاڑ دیتا۔"

مگر خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے یہ فقرہ بھی پنجابی زبان میں کہا تھا۔ کوئی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ مگر ان کے لب و لہجے اور غیظ و غضب نے سب کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ ہم نے زیرلب کہا۔

"خدا کے لیے ہوش میں رہو۔ کیوں اپنی اور ہماری بے عزّتی کرانے پر تُلے ہوتے ہو۔"

اِتنے میں ایئر ہوسٹس بھی بوکھلائی ہوئی ہمارے پاس آ گئی تھی اور اپنی غزال جیسی آنکھوں سے یارخاں کو دیکھ رہی تھی جو ہماری بات سننے کے بعد سیٹ پر نیم دراز ہو کر لمبی لمبی سانس لے رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے بتایا کہ یہ کوئی یوگا کی مشق ہے جس سے انسان کے لیے غصّے پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

ایئر ہوسٹس نے امریکی لہجے میں پوچھا۔

"کوئی گڑبڑ ہے کیا ؟ ڈاکٹر کو بلاؤں ؟"

ہم نے کہا۔

"فکر کی بات نہیں ہے۔ بس ذرا بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ ہوائی جہاز میں دیر تک سفر کرنے سے ان کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔"

وہ دوڑی دوڑی گئی اور کورومین پانی کے گلاس میں ڈال کر لے آئی۔ ہمارے منع کرتے کرتے اس نے یارخاں کو آہستگی سے پکارا اور انھوں نے آنکھیں کھولیں تو بہت لگاوٹ سے بولی۔

"لیں۔ یہ پی لیجئے۔"

یارخاں ایک دم اٹین شن ہو گئے۔ پوچھنے لگے۔

"شراب ہے ؟"

اس کی سادگی ملاحظہ ہو۔ پوچھنے لگی۔

"شراب کی ضرورت ہے تو وہ لے آؤں!"

یار خاں نے "لاحول ولا قوۃ" کا زوردار نعرہ مارا اور وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ انھوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینی شروع کر دیں۔

"اب تو ڈاکٹر کو بُلانا ہی پڑے گا" ایئر ہوسٹس نے کہا۔

طارق نے فوراً پیش کش کر دی۔

"ڈاکٹر واکٹر کو چھوڑیئے۔ دو گھونٹ پلا دیجئے۔ بھلے چنگے ہو جائیں گے"

خیریت یہ گزری کہ یار خاں اس وقت لمبی لمبی سانسیں لینے میں مصروف تھے ورنہ واقعی فساد برپا ہو جاتا۔ مگر اس ڈرامے کا فائدہ یہ ہوا کہ یار خاں کی "بیماری" کے پیشِ نظر ہوائی جہاز کے مسافر اور عملہ سمیت ہر کوئی انھیں سپیشل ٹریٹمنٹ دینے لگا۔ ایئر ہوسٹس گھڑی گھڑی ان سے پوچھتیں۔

"اور کچھ چاہیئے؟"

ہوائی جہاز کا کیپٹن بطور خاص انھیں "ہیلو" کہنے آیا اور سگریٹ کی ایک ڈبیہ دی۔ آس پاس کے لوگ بھی انھیں ہمدردی اور محبت سے دیکھتے رہے۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی فرنگی حسینہ بار بار مُڑ کر انھیں دیکھتی اور حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتی۔ یار خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جب ہم روم کے ایئرپورٹ پر اُترنے لگے اور سامنے والی حسینہ نے انھیں مُسکرا کر خدا حافظ کہتے ہوئے محبت بھرے انداز میں ان سے ہاتھ بھی ملایا تو یار خاں کافی دیر اس کا ہاتھ تھامے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ پیچھے والے مسافروں نے انھیں دھکیلنا شروع کر دیا۔ دل پر پتھر رکھ کر وہ ہوائی جہاز سے تو نکل آئے مگر بار بار کہہ رہے تھے۔

"یار۔ اُسے سچ مچ مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر لندن تک ہمارے ساتھ

سفر کرتی تو تمھاری بھابھی بن جاتی۔ دیکھا نہیں۔ کتنے پیار سے دیکھ رہی تھی؟ ویسے یار یہ گوری چمڑی والی لڑکیاں پیار ویار کی قائل تو نہیں ہوتیں۔ مگر جب کسی سے پیار کرتی ہیں تو پیار میں جان دے دیتی ہیں۔"

"جیسے لیلیٰ مجنوں" منوّر نے لقمہ دیا۔

"جاہل ہیں آپ۔ رومیو جولیٹ کہتے ہوئے آپ کو موت آتی ہے؟"

یار خاں جل کر بولے۔

بہرحال — اس گمنام حسینہ کی یاد پورے سفر کے دوران انھیں بے طرح ستاتی رہی۔ بار بار پچھتاتے تھے، ہائے۔ میں اس کا نام اور پتہ ہی پوچھ لیتا تو کیا تھا؟

"کم از کم فون نمبر ہی لے لیا ہوتا" ہم نے مشورہ دیا۔

"فون والی بات غلط ہے"

"کیوں؟" ہم نے پوچھا۔

"یار فون کا خرچہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور تمھیں تو پتہ ہے کہ محبت کرنے والے کبھی مختصر بات نہیں کرتے"

رُوم

روم کا ائیرپورٹ بیروت سے بھی زیادہ پُرشکوہ اور بارونق تھا۔ چہل پہل اور رونق بھی زیادہ تھی۔ ہم درجہ بدرجہ جدید تہذیب و تمدن کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ کسٹم کے لوگ انتہائی خوش اخلاق اور ہنس مُکھ نکلے۔ انھوں نے ہمارے سامان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بعد میں ہم یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی گئے اور معلوم ہوا کہ اُن دنوں کسٹم کی چیکنگ برائے نام ہی ہُوا کرتی تھی جب کہ ہمارے کراچی ائیرپورٹ پر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اور کسٹم کی سختیاں۔ توبہ۔ توبہ۔ خیر اس کا وقت آنے پر تذکرہ ہوگا۔ پہلے روم کی داستان سُنیئے۔

امیگریشن سے باہر نکل کر انتہائی وسیع لاؤنج میں پہنچے تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بھئی واہ۔ ہم تو بیروت کے ائیرپورٹ کو دیکھ کر ہی حیران رہ گئے تھے۔ یہ تو پھر روم تھا۔ چاروں طرف آئینہ گری، اور فرش اس قدر خوبصورت کہ جی چاہتا تھا بس یہیں لیٹ جاؤ۔ آس پاس خوش جمال اور خوبصورت لوگوں کی آمدورفت نے ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں فلم ساز راشد مختار اور ہدایتکار پرویز ملک کو تلاش کرنا تھا جو روم میں ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے سامان یار خاں کی تحویل میں دیا اور انھیں خاص طور پر ہدایت کی کہ دیکھو سامان اٹھانے کے لیے لوڈر

کی خدمات حاصل نہ کرنا۔ یورپ میں سب لوگ اپنے کام خود ہی کرتے ہیں۔ اور پھر لوڈر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔

"مگر یار میں سامان کا کیا کروں؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

ہم نے کہا۔

"بس اِس کونے میں کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو یہاں سے حرکت نہ کرنا۔ ہم ان لوگوں کو تلاش کرکے یہیں آجائیں گے۔"

پھر ائیرپورٹ کی وسعت اور ہنگامہ خیزی کے پیشِ نظر ہم نے وہ مقام بھی یاد کر لیا جہاں خاں صاحب اور منّور کو چھوڑا تھا۔ اب ہمیں راشد صاحب کی تلاش ہوتی ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک سارا ائیرپورٹ چھان مارا۔ اوپر نیچے ہر جگہ دیکھ لیا یہاں تک کہ باہر ٹیکسی سٹینڈ تک ہو آئے مگر ان دونوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اب تو ہم واقعی پریشان ہو گئے۔ پی۔ آئی۔ اے کا کاؤنٹر تلاش کرکے وہاں پہنچے تو معلوم ہُوا کہ ان کی کوئی فلائیٹ نہیں آتی اِس لیے بند ہے۔ خدایا۔ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ ایک اجنبی ملک، میزبانوں کا کوئی پتہ نشان نہیں۔ جیب میں پیسہ نہیں اور روم ہمارے لیے بالکل انجانا شہر۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پریشانی کے عالم میں گھومتے رہے جب یقین ہو گیا کہ ہمیں لینے کوئی نہیں آیا ہے تو مایوس ہو کر یار خاں کے پاس گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں ہم وہ جگہ بُھول گئے جہاں انھیں چھوڑ کر آگئے تھے۔ بوکھلاتے بوکھلاتے چاروں طرف پھرتے رہے۔ آخر یار خاں نظر آگئے۔ وہ ہوائی جہاز کے کپتان کے پیش کیے ہوئے سگریٹ سے لُطف اندوز ہو رہے تھے اور نظریں اِردگرد کا طواف کر رہی تھیں۔ ہمیں انھوں نے دیکھا ہی نہیں۔ ظاہر ہے دیکھنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔ ہم پر ان کی کیا نظر پڑتی۔ ہم نے انھیں باقاعدہ جھنجھوڑا تو چونک کر کھڑے ہو گئے۔

"چلو، چلیں؟!"

"کہاں چلیں، ان میں سے تو کوئی موجود نہیں ہے۔"

"ارے یار مذاق مت کرو۔"

"مذاق کی بات نہیں ہے۔ ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

خاں صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بولے۔

"اب کیا ہوگا۔ ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔"

ہم نے انھیں تسلّی دی اور کہا۔

"یار گھبراتے کیوں ہو۔ اللہ مالک ہے۔ تم دونوں اپنے اپنے بیس روپے نکالو تاکہ مَیں اطالوی کرنسی میں تبدیل کراؤں۔"

کہنے لگے۔

"بیس روپلّی سے کیا ہوگا۔ لگتا ہے ہمیں تو روم میں بھیک مانگنی پڑے گی۔"

بہرحال۔ انھوں نے روپے ہمارے حوالے کیے اور ہم نے "کرنسی ایکسچینج" کی کھڑکی کا رُخ کیا اور اپنے احتیاط سے بچاکر رکھے ہوئے بیس ڈالر اور مبلغ ساٹھ روپے اس حسین و جمیل خاتون کے حوالے کر دیئے جو کھڑکی میں بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ انھوں نے حساب کتاب کرنے کے بعد پانچ ہزار سات سو لیرا ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ سر سے پیر تک جائزہ لیا اور مُسکرا کر انگریزی میں پوچھنے لگیں۔

"آپ انڈین ہیں؟"

ہم نے بھی مُسکرا کر انھیں دیکھا اور انکار میں سر ہلاتے ہُوئے پوچھا۔

"آپ جرمن ہیں؟"

انھوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔

"یہ آپ کو کیسے خیال ہوا؟ دیکھتے نہیں مَیں روم کے ایئرپورٹ پر بیٹھی ہوں۔"

ہم نے کہا۔

"آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے ابھی پاکستانی کرنسی تبدیل کرائی ہے۔ اِس لیے ظاہر ہے کہ پاکستانی ہیں۔"

"اوہ۔ معاف کرنا۔ دراصل دیکھنے میں آپ اور انڈین ایک جیسے لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔

"جس طرح آپ اور جرمن ایک جیسے لگتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ہم انھیں حیران چھوڑ کر یار خاں کی طرف گئے۔ پانچ ہزار سات سو لیرا انتہائی قلیل رقم تھی۔ جو ہم تین افراد کے لیے روم جیسے مہنگے شہر میں شاید دو وقت کے کھانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ پھر قیام اور طعام کا مرحلہ تھا۔ کسی سستے سے معقول ہوٹل کو تلاش کرکے وہاں تک پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ اُدھر ہمارے میزبانوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان سے رابطہ کیوں کر قائم کیا جائے؟

سامنے نظر پڑی تو دیکھا کہ یار خاں تمام سامان ایک ٹرالی پر رکھوائے کھڑے ہیں اور اطالوی پورٹر دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اور شانے اُچکا کر نہ جانے ان سے کیا کہہ رہا ہے۔ ہمیں دیکھا تو خوش ہو کر ہماری طرف بڑھے۔

"سنو یار۔ مَیں نے یہ قُلی کر لیا ہے۔ بہت سستا مل گیا ہے؟"

ہم نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"کتنا سستا؟"

کہنے لگے۔

"یہ تو مَیں نے پُوچھا نہیں۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا بہت سستا لوڈر ہوں۔"

ہم نے لوڈر سے پوچھا۔

"سامنے ٹیکسی تک کیا لو گے ؟"

بولا۔

"سات سو لیرا۔"

یار خاں نے بھی سُن لیا تھا۔ ان پر تو قریب قریب غشی کا عالم طاری ہونے لگا۔

ہم نے کہا۔

"سُن لیا آپ نے۔ یہ سات سو لیرا لے گا۔ وہ سامنے ٹیکسی تک جانے کا معاوضہ۔ جانتے ہو سات سو لیرا کتنے ہوتے ہیں ؟"

وہ سہم کر بولے۔

"نہیں تو۔ مگر یار ایمان سے مجھے . . . "

ہم نے کہا۔

"آپ کو پتہ نہیں کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لگتا ہے ہمیں ایئر پورٹ پر یہ گِروی رکھ لیں گے۔ اور ہم قُلیوں میں بھرتی ہو کر گزارہ کریں گے۔"

منّور بھی پریشان تھا۔ کہنے لگا۔

"صاحب مَیں نے تو ان سے کہا تھا مگر یہ بولے قُلی کتنے پیسے لے گا۔ آرام سے سامان تو چلا جاتے گا۔"

ہم نے کہا۔

"یہ پاکستان کا قُلی نہیں ہے۔ یہ رُوم کا قُلی ہے۔ اس کو سات سو لیرا دے کر ہم خود کیا کھائیں گے ؟"

دراصل خاں صاحب کو لیرا کی کم قیمتی کا اندازہ ہی نہیں تھا اِس لیے سات سو لیرا سُن کر گھبرا گئے تھے۔ ان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ سچ مُچ ان کا بلڈ پریشر

ہائی ہو جاتے۔ ہم نے ترس کھا کر کہا۔

"خیر، اب کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آئندہ کے لیے کان کھول کر سُن لیجئے۔ اگر میری بات نہ مانی تو مَیں دونوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

یار خاں بولے۔

"یار سُنو۔ اِس قُلی کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔

"اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ خیر۔ چلو۔"

ہمیں یہ امید تھی کہ شاید راشد مختار یا پرویز ملک میں سے کسی کی صورت نظر آجائے مگر بے سود۔ بیرونی لابی میں ہوٹل والوں کے نمائندوں نے ہمیں گھیر لیا اور وہ چائیں چائیں کی کہ ہم گھبرا گئے۔ ایک خوبصورت لڑکی بھی ہمیں اپنے ہوٹل چلنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ یار خاں کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے اِس کے ہوٹل چلتے ہیں۔"

ہم نے مذاکرات شروع کیے تو پتہ چلا کہ بہت مہنگا ہوٹل ہے اور روم کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ بہت سے لوگوں سے بچ بچا کر بالآخر ہم نے ایک نوجوان کو پسند کیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہوٹل ریلوے سٹیشن کے نزدیک ہے اور بہت سستا ہے۔ تین مہمانوں کے لیے صرف دس ڈالر روزانہ۔ اب اس سے سستا ہوٹل روم میں اور کیا ہو سکتا تھا ؟ ہم نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس نے فوراً ہمارا سامان ایک ٹیکسی میں رکھوایا جس کا کرایہ ڈھائی ہزار لیرا طے پایا۔ یار خاں ٹیکسی میں تو بیٹھ گئے مگر بار بار پوچھ رہے تھے۔

"یہ اتنے بہت سے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ خدا کا واسطہ۔ کہیں گروی نہ رکھوا دینا۔"

اِتنی دیر میں ٹیکسی ائیرپورٹ سے نکل کر روم کی کشادہ اور خوبصورت سڑکوں پر رواں دواں ہو گئی تھی۔

بعد میں ہمیں معلوم ہُوا کہ روم میں ریلوے سٹیشن اور ائیرپورٹ پر حکومت نے ہوٹلوں کی بکنگ کے سلسلے میں بہت اچھّا انتظام کیا ہے۔ ایک بہت بڑے بورڈ پر مختلف ہوٹلوں کے نام اور فون نمبر لکھے ہیں۔ آپ اِس نمبر کا بٹن دبائیں اور براہِ راست ہوٹل سے بات کر کے معلومات حاصل کریں اور سب کچھ طے کر کے آرام سے وہاں پہنچ جائیں۔ مگر اطالوی بہت کاریگر لوگ ہیں۔ اِس بندوبست کے باوجود وہ نووارد اور ناتجربہ کار مسافروں کو ٹھگنے سے باز نہیں آتے۔ مثلاً ہم دوسری بار اپنی بیگم اور ایک دوست کے ساتھ بذریعہ ریل روم گئے اور ایک ہوٹل کے مینجر سے جملہ معاملات طے کر کے بس میں سوار ہو کر ہوٹل پر پہنچے۔ یہ ہوٹل کافی دُور دراز علاقے میں تھا۔ ہوٹل پہنچے تو وہاں کاونٹر پہ ایک خاتون بیٹھی مسکرا رہی تھیں جبکہ ہماری گفتگو کسی مرد سے ہوئی تھی۔ ہم نے انھیں اپنی ضروریات بتائیں۔ اور انھوں نے نہایت خوش اخلاقی سے رجسٹر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے دستخط کرنے سے پہلے عادتاً کرایہ پھر پوچھ لیا۔ انھوں نے طے شدہ کرائے سے دوگنا بتایا تو ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے کہا۔

"ابھی ہم نے فون پہ ایک صاحب سے بات کی تھی۔ انھوں نے تو اس سے نصف کرایہ بتایا تھا"

کہنے لگیں۔

"صاحب؟ کون صاحب؟ یہاں تو میری ڈیوٹی ہوتی ہے اور صبح سے مَیں ہی یہاں بیٹھی ہوں۔ اِس وقت تو سارے ہوٹل میں کوئی مرد نہیں ہے"

ہم سب حیرانی سے اُنھیں دیکھنے لگے۔ بولیں۔

"کرایہ مَیں آپ کے لیے کچھ اور کم کر دوں گی۔ فی کمرہ ایک ایک ڈالر کی

کمی ٹھیک رہے گی؟"

انھوں نے دلآویز انداز میں ہمیں دیکھا۔

ہمارے دوست اور ہماری بیگم اس جھگڑے کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ یوں بھی ہم لوگ تھکے ماندہ تھے۔ اور ہوٹل پہنچ کر دوبارہ کسی اور جگہ کی تلاش میں مزید خوار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مگر ہمیں یہ ٹھگی کا انداز بہت بُرا لگا۔ ہم نے وہاں سے واپس ہونے کا قصد کیا تو وہ خاتون مزید رعایت پر آمادہ ہو گئیں۔ جب ہم کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو انھوں نے پکار کر مزید دو ڈالر رعایت کرنے کی پیش کش کر دی۔ مگر ہم نے سوچا جو لوگ اس قدر فریبی ہیں نہ جانے یہ بعد میں ہمارا کیا حشر کریں گے۔ ہم ہوٹل کے برآمدے سے باہر نکل رہے تھے تو ہمیں ایک نوجوان باغ میں پودوں کو پانی دیتا ہوا نظر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جھٹ دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہی وہ حضرت ہیں جنھوں نے ہم سے فون پر بات کی ہو گی۔ خیر وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ائیرپورٹ پر ہم سے جو کرایہ طے کیا گیا تھا اس کی پوری طرح پابندی کی گئی۔ روم کا ائیرپورٹ شہر سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہوٹل تک جاتے ہوئے ہم نے شہر کا کافی حصّہ دیکھ لیا جس میں بہت سی تاریخی عمارتیں بھی تھیں، جن کے بارے میں اب تک ہم صرف کتابوں میں پڑھتے یا فلموں میں دیکھتے آتے تھے۔ اب وہ ہماری نظروں کے سامنے تھیں اور اتنی زیادہ خوبصورت نہیں لگ رہی تھیں جتنی کہ تصویروں اور فلموں میں نظر آتی ہیں۔ کُشادہ اور خوبصورت سڑکوں اور باغات و سبزے کے قطعات سے گزرتے ہوئے ہم روم کے بارے میں سوچتے رہے۔ اللہ اللہ۔ کیا شہر ہے اور اس کی کیا تاریخ ہے؟ اس قدر قدیم اور روایتی شہر ہے کہ اسے "دوامی شہر" کا نام دیا گیا ہے۔ جو خدا جانے کب سے آباد ہے اور آئندہ نہ جانے کب تک قائم رہے

گا۔ اس شہر کا چپہ چپہ تاریخی عمارتوں، یادگاروں اور نوادرات سے بھرا پڑا ہے۔ عالم یہ ہے کہ کسی کھنڈر میں کوئی ایک اینٹ بھی اُٹھاؤ تو قدیم تہذیب کی نشانی مل جائے گی۔

موسم بہت اچھا تھا اور ہم روم کی طلسماتی فضا میں گُم ہو گئے تھے۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور جو نہایت صاف ستھرا اور خوش شکل نوجوان تھا اپنی زبان میں نہ جانے مسلسل کیا بولے جا رہا تھا۔ ہم نے اطالویوں کے باتونی ہونے کے بارے میں سُنا تو تھا مگر جب دیکھا تو مان گئے کہ مسلسل بے تکان بولنے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ہاں فرانس والے کسی حد تک مقابلہ کر سکتے ہیں مگر وہ بھی اِن کا جوڑ نہیں ہیں۔ وہ اللہ کا بندہ ہمیں ہر تاریخی عمارت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر جگہ کا تعارف کرا رہا تھا۔ مگر قسم لے لیں جو ایک لفظ بھی ماسوائے چند مشہور ناموں کے، ہمارے پلّے پڑا ہو۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ ہم اس کی بات پر کان دھر رہے ہیں اور اُسے سمجھ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ اُسے تو بس بولنے سے کام تھا۔ یار خاں تنگ آ کر بولے۔

"یار اسے چُپ کراؤ۔ اس کی تو چابی ہی ختم نہیں ہو رہی۔"

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے تیزی سے حرکت دیتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ اچانک خاموش ہو کر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ہم نے کہا۔

"وی سپیک انگلش۔ نو اٹیلین!"

اس نے تعجب سے ہمیں دیکھا۔

"نو اِتالین؟ اوتے۔"

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ کمال کا آدمی تھا جسے نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ بس بولنے سے سروکار تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کوئی لطیفہ یا مزیدار بات سُنا کر زور زور سے ہنستا اور ہماری طرف یوں دیکھتا

تھا جیسے ہم بھی اس کے مذاق سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ یک طرفہ ٹریفک اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ہم روم کے قدیم شہر میں نہیں پہنچ گئے۔ پتلی پتلی پتھریلی تنگ گلیاں اور پُرانے پُرانے دو رویہ مکانات۔ مگر صاف ستھرے۔ ٹریفک بے پناہ تھا اور کافی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پتلی تنگ سڑکوں اور گلیوں میں سے ہماری ٹیکسی بڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ کئی بار تو ٹکر ہوتے ہوتے بچ گئی مگر دونوں ڈرائیوروں نے پوری قوت سے بریک مار کر حادثے کو بچا لیا۔ خاص بات یہ کہ دونوں میں سے کسی کی پیشانی پر بھی بَل نہیں دیکھا۔ مسکرا کر آگے چل پڑے۔ ہمارا ملک ہوتا تو اب تک فساد ہو چکا ہوتا۔ چوڑی اور تنگ گلیوں کے دونوں طرف واقع قدیم تاریخی عمارتوں کے بارے میں ٹیکسی ڈرائیور ہمیں بتاتا رہا۔ مگر ہم کیا کیا دیکھتے۔ روم میں تو ہر طرف تاریخ بکھری پڑی ہے۔ قریب قریب ہر عمارت قدیم اور تاریخی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے اِن عمارتوں کو بہت احتیاط اور سلیقے سے محفوظ رکھا ہے۔ بہت سے کمرشل علاقوں میں ان کی ضروری مرمت بھی کی ہے مگر عمارت کی اصل شکل و صورت کو برقرار رکھا ہے۔ ان میں بعض عمارتوں میں ہوٹل۔ ریسٹوران، دکانیں اور سینما بن گئے ہیں۔ باہر سے یوں لگتا ہے جیسے ایک پرانی تاریخی عمارت ہے۔ اندر قدم رکھو تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

گلیاں اور بازار نشیب و فراز میں تھے۔ کہیں پتلی سی سڑک اوپر کو جا رہی ہے تو کہیں نیچے ڈھلان میں چلی گئی ہے۔ دراصل روم کئی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ روم کا شہر سات پہاڑیوں پر آباد تھا اور ظاہر ہے کہ ابھی تک جوں کا توں ہے۔ روم والوں کو اپنے تاریخی شہر اور قدیم ثقافت پر اگر ناز ہے تو بے جا نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر قدیم تہذیب و تاریخ کی نشانیاں موجود ہیں۔ کسی اور مُلک میں غالباً اتنی تاریخی عمارتیں اور یادگاریں نہیں ہوں گی جتنی روم کے

ایک مرلے میں واقع ہیں۔ جس چیز کے بارے میں پوچھو ہزاروں سال سے کم پُرانی نہیں ہے۔ اور بدستور قائم و دائم ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ عمارتوں اور در و دیوار کے برعکس انسانوں کو فنا ہے ورنہ اگر کہیں اللہ تعالیٰ مہربان ہو کر وہاں کے رہنے والوں کو بھی عمارتوں کی طرح حیاتِ دوام بخش دیتا تو ذرا سوچئے کیا ہوتا۔ یعنی ذرا تصور کیجئے کہ ایک دس ہزار سال پُرانی عمارت کے سامنے دو ہزار سال کی عمر کے ایک بزرگ ٹافیاں بیچتے ہوتے یا آئس کریم فروخت کرتے ہوتے نظر آتے۔

واللہ۔ کیا خوب منظر ہوتا وہ بھی!!

ایک بہت لمبی اور پتلی پتھروں کی سڑک پر سے گزرتے ہوئے، چڑھائیاں چڑھ کر آخرکار ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ اٹلی والوں کی یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ پُرانے شہر کی بے انتہا پتلی گلیوں میں بھی وہ ایک جانب اور اگر گنجائش ہو تو دونوں جانب اپنی کاروں کو بمبر سے بمبر ملا کر صراطِ مستقیم میں پارکنگ کرتے ہیں۔ درمیان میں صرف ایک گاڑی کی آمد و رفت کے لیے جگہ باقی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطان کی آنت کی مانند لمبی اور بے حد تنگ بَل کھاتی ہوئی گلی یا سڑک پر ایک وقت میں ایک ہی جانب ٹریفک چل سکتا ہے۔ اصولاً تو اِن گلیوں اور سڑکوں پر وَن وے ٹریفک ہونا چاہیئے۔ مگر اٹلی والے بلا وجہ قاعدے قانون میں اپنا وقت ضائع کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ بس چل سو چل پہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ اِن تنگ گلیوں میں وہ کیوں کر اتنی تیزی سے ڈرائیونگ کرتے ہیں؟ اِس کا نظارہ ہم نے اگلے ہی دن کر لیا۔ مگر پہلے ذرا ہوٹل کے بارے میں کچھ سُن لیجئے۔

ہوٹل کا نام ایلیٹ تھا۔ باہر سے یہ ایک تنگ سڑک پر واقع چھوٹا سا ہوٹل نظر آتا تھا مگر جب اندر گئے تو نہایت کشادہ اور خوبصورت پایا۔ سنگِ مرمر کا فرش دیرروم میں بہت عام ہے، لکڑی کی دیواریں، پرانی وضع کا فرنیچر، بیش قیمت قالین، فانوس

روشنیاں اور لکڑی کے چکّر دار زینے۔ ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن تھا بے حد آرام دہ۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارا سامان لا کر اندر رکھ دیا اور ہم نے اسے ڈھائی ہزار لیرا گِن کر دے دیئے۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں ہمیں دیکھتا رہا۔ یار خاں نے حکم دیا۔

"یار اسے ٹِپ بھی دو نا۔ کیا سوچے گا ہم پاکستانیوں کے بارے میں؟"

ہم نے کہا۔

"سوچے گا تو ہمارا کیا بگاڑے گا۔ مگر ٹِپ دے کر شاید ہمارا بہت کچھ بگڑ جاتے گا۔ ہمیں تو خود چندے کی ضرورت ہے۔ پتہ ہے اب ہمارے پاس کتنے لیرا بچے ہیں؟"

یار خاں کا مُنہ اُتر گیا۔ کہنے لگے۔

"یار پردیس میں ذلیل کرا دیا ہے تم نے۔ خیر۔

"بُرا وقت تو بادشاہوں پر بھی آتا ہے۔"

ٹیکسی والا مُسکراتا ہوا رُخصت ہو گیا مگر جانے سے پہلے کاؤنٹر پر موجود ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ گپ شپ کرنے سے باز نہ آیا۔ ہوٹل کے مینجر، جو بعد میں مالک بھی نکلے، تمام اطالویوں کی طرح ہنس مُکھ تھے۔ انھوں نے ہوٹل کے باہر ایک بورڈ لگا رکھا تھا جس پر لکھا تھا کہ یہاں انگریزی جاننے والا عملہ موجود ہے۔ ہم خوشی خوشی اِن سے مخاطب ہوئے تو وہ سر ہلانے لگے۔ کافی دیر بعد بولے۔

"میرا نام گویدو ہے۔ انگریزی جانتا ضرور ہوں مگر آپ کی طرح اعلیٰ قسم کی انگریزی سے نابلد ہوں۔"

یار خاں بولے۔

"یار یہ تو تمھاری انگریزی کی تعریف کر رہا ہے۔ تم تو چھپے رُستم نکلے۔"

ہم نے کہا۔

"تعریف نہیں کر رہا۔ دراصل یہ ہم سے بھی گئی گز ری انگریزی جانتا ہے"۔

بہرحال گوید و صاحب نے حسبِ معاہدہ ہمیں تیر ا بیڈ والا کمرہ دے دیا اور کرایہ بھی وہی بتایا جو ایئرپورٹ پر طے ہو چکا تھا، یعنی ا دس ڈالر۔ کمرے کی چابی ہمیں دینے کی بجائے انھوں نے پکار کر کہا۔ "اینا اینا" یہ نام سُن کر یار خاں کے کان کھڑے ہو گئے۔ منوّر اور ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے باورچی خا سے ایک چودہ پندرہ سال کی صحت مند اور خوش شکل لڑکی نکل کر آئی جسے گوید و صاحب نے اپنی زبان میں ہدایات دیں اور چابی اس کے حوالے کر دی۔ فخریہ کہنے لگے

"یہ میری بیٹی ہے اینا۔ انگریزی نہیں جانتی"۔

ہمارا سامان انھوں نے خود اُٹھا لیا اور اینا کی قیادت میں ہم سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں پہنچ گئے۔ خاصا آرام دہ اور سجا ہوا کمرہ تھا۔ باتھ روم بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ بعد میں تجربے نے بتایا کہ یورپ میں جن کمروں کے ساتھ باتھ روم ہو ہے وہ مہنگے ہوتے ہیں۔ گوید و صاحب نے پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں خدا جانے کیا ہدایات دیں اور اینا سمیت رُخصت ہو گئے۔

اب ہمیں اپنی حالتِ زار کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ملا۔ غور کیا تو خاصے ناگفتہ حالات تھے۔ یار خاں اور منوّر کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"یار کمرہ تو لے لیا مگر کرایہ کیسے دو گے۔ اور ہم کھائیں گے کیا؟ پیسے تو ہیں نہیں"۔

ہم نے کہا۔

"اللہ مالک ہے"۔

اور فون پر پی آئی اے کے دفتر سے رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ معلوم ہوا ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض بھی گوید و صاحب ہی سرانجام دے رہے تھے۔ پی آئی اے کا نام سُن کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔

"ویری گڈ۔ پی آئی اے۔ آئی نو۔ گڈ پیپل"۔

پی آئی اے کو یہ سرٹیفکیٹ عطا کرنے کے بعد انھوں نے ٹیلی فون ملانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف کسی غیر ملکی نے فون اُٹھا کر اطالوی زبان میں تقریر شروع کر دی۔ ہم نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

"یہ پی آئی اے کا دفتر ہے؟"

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب ملا۔

"جی ہاں"۔

ہم نے کہا۔

"مینجر یا کسی اور آدمی سے ملاؤ"۔

بولے۔

"کوئی نہیں ہے۔ مَیں اکیلا ہوں"۔

پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

کہنے لگے۔

"چوکیدار۔ پرسوں صبح فون کرنا تو مینجر مل جائیں گے۔ خدا حافظ"۔ اور فون بند کر دیا۔

لیجئے۔ امید کی ایک کرن تو غائب ہو گئی۔ ہمارا خیال تھا شاید پی آئی اے والوں کو راشد صاحب وغیرہ کے بارے میں علم ہو گا۔ مگر وہاں تو پی آئی اے کا عملہ ہی لاپتہ تھا۔ دن کا وقت تھا۔ ہم حیران کہ پی آئی اے والے کہاں چلے گئے؟ پھر پاکستانی

سفارت خانے سے فون ملوایا۔ وہاں سے معلوم ہُوا کہ ایک بڑے افسر پاکستان سے آتے ہوتے ہیں اِس لیے سارا عملہ انھیں وینس دکھانے لے گیا ہے۔ وہاں بھی ایک اطالوی چوکیدار صاحب موجود تھے جن کی انگریزی کو سمجھنا خود انگریزوں کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ گویا ہمیں نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اب واحد اُمید یہ باقی رہ گئی تھی کہ دوسرے دن رات کو (روم کے وقت کے مطابق صبح چار بجے) پاکستان سے باقی ماندہ یونٹ بھی پہنچ رہا تھا۔ سوچا انھیں لینے کے لیے تو راشد صاحب ضرور جائیں گے۔ ان سے وہاں رابطہ ہو جائے گا۔

یار خاں کہنے لگے۔

"بھائی میری بات سُنو۔ رُوم اِتنا بڑا شہر ہے۔ اس میں ہم کہاں ہیں راشد صاحب نہیں جانتے۔ وہ کہاں ہیں ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یونٹ والے کہاں ٹھہریں گے۔ یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یار تم تو مروا دوگے۔"

ہم نے کہا۔

"دیکھو خاں صاحب اِن مسائل پر لعنت بھیجو۔ اللہ نے روم دیکھنے کا موقعہ دیا ہے۔ کل رات تک کے لیے پریشانی چھوڑ دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جو ہوگی دیکھی جائے گی۔ اب جلدی سے تیّار ہو جاؤ۔"

یار خاں کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے مگر وہ اور منوّر فوراً تیار ہوگئے۔

اور ہم نے آس پاس کے علاقے میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہوٹل سے ہم نے احتیاطاً ایک کارڈ بھی لے لیا تھا تاکہ راستہ بھول جائیں تو کسی کو کارڈ دکھا کر ہوٹل تک تو پہنچ جائیں۔

دو تین گھنٹے تک ہم حیرانی کے عالم میں گھومتے اور رُوم دیکھتے رہے۔ ریلوے سٹیشن واقعی بالکل نزدیک تھا۔ آس پاس درجنوں تاریخی عمارتیں "کلیسا" مجسّمے اور دوسری

یادگاریں تھیں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں تھے مگر سب کے سب نادرالوجود تھے۔ گلیاں، سڑکیں، بازار، شاپنگ سنیٹر خاصے صاف سُتھرے تھے۔ لوگ بہت ہنس مُکھ اور با اخلاق۔ ہم ایک پلازا میں پہنچ گئے۔ ہر طرف ایک جیسی پُرانی طرز کی عمارتیں تھیں جن کے آگے نہایت بلند ستونوں والے وسیع برآمدہ تھا۔ یہ بازار گولائی میں تھا۔ عمارتیں خُدا جانے کس سنِ عیسوی میں بنی ہوں گی مگر یوں لگتا تھا جیسے ان کی مسلسل مرمّت اور دیکھ بھال ہوتی رہی ہے۔ ان کے اندر سینما بھی تھے، دوکانیں اور ریستوران بھی، کلب اور تماشہ گاہیں بھی۔ ہم نے صرف کھڑکیوں میں سجے ہوئے سامان کو دیکھنے پر اکتفا کی کہ اس سے زیادہ کی استطاعت نہیں تھی۔

یار خاں بہت خوش اور تر و تازہ رہے۔ ہر طرف خوبصورت، صحت مند لوگ، ماہتاب چہرہ خواتین، آفتاب چہرہ مرد۔ اتنے بہت سے غیر مُلکی اور وہ بھی حسین و جمیل ہم نے کاہے کو یک جا دیکھے تھے۔ پھر اس پر ستم ان کا لباس، آرائش اور میک اَپ بعد میں ہم نے یورپ کے اور ملک بھی دیکھے مگر روم میں اور اطالوی قوم میں ہم نے جو بے تکلفی، خوش اخلاقی اور زندہ دلی پائی وہ کہیں اور نہیں دیکھی۔ قد و قامت، صورت شکل اور عادات و اطوار میں انھیں بہت حد تک پنجابیوں کی طرح پایا۔ سارے یورپ میں یہ منظر روم ہی میں دیکھا کہ ایک پارک میں بازی گر کا تماشا ہو رہا ہے اور دیکھنے والے مرد و عورت کا ایک ہجوم اکٹّھا ہے۔ فٹ پاتھ پر پامسٹ اور دوائیں بیچنے والے بھی گاہکوں میں گھرے نظر آتے مگر نہایت صاف سُتھرے اور سلیقے سے سامان سجاتے ہوئے۔ جسے دیکھو کون آئس کریم ہاتھ میں لیے گھوم رہا تھا۔ کون آئس کریم اس وقت تک لاہور میں متعارف تو ہو چکی تھی مگر عام نہیں ہوئی تھی۔ آئس کریم ہماری بھی کمزوری ہے اور یار خاں کے منہ میں بھی پانی بھر آرہا تھا۔

آخر نہیں رہا گیا۔ ملتجیانہ لہجے میں کہنے لگے۔

"یار۔ اور کچھ نہیں تو آئس کریم ہی کھلا دو۔"
ہم نے کہا۔
"آپ کو پتہ ہے کہ ہم بھی بہت شوقین ہیں۔ مگر پیسے نہیں ہیں۔"
انھوں نے سامنے کاؤنٹر پر جاکر خوبصورت مگر تنومند عورت سے پوچھا۔
"ہاؤ مچ؟"
اس نے مسکرا کر انگلی اٹھائی "ہنڈریٹ لیرا"۔
دوڑے دوڑے واپس آئے۔
"صرف ایک سو لیرا کی ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"
ہم نے کہا۔
"صرف ایک سو لیرا!؟ پتہ ہے ہمارے پاس کُل کتنے لیرا ہیں اور آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے ہم کوئی امریکی لکھ پتی ہوں۔"
وہ شرمندہ ہو گئے۔ کہنے لگے۔
"اچھا ایک کون لے لیتے ہیں۔ تینوں باری باری کھالیں گے۔"
منّور نے فوراً کہا۔
"مجھے آئس کریم پسند نہیں ہے۔ آپ دونوں کھائیے۔"
"لو۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ ایسا کرو۔ تم آئس کریم کھا لینا۔ میں کون کھا لوں گا۔ یار آخر روم کی کون آئس کریم چکھنی تو چاہیئے نا۔"
ہمیں ان کے ندیدے پن پر بالکل غصہ نہیں آیا۔ فلک کی کج رفتاری پر البتہ ایک آہ سرد کھینچی۔ کیا وقت ہے کہ ایک کون آئس کریم بھی سالم نہیں کھا سکتے ہیں۔ مگر پھر سوچا جہاں ستیاناس۔ وہاں سوا ستیاناس۔ پیسے تو ویسے بھی کم ہیں۔ ایک ایک کون کھانے میں ہرج کیا ہے؟ اتنی دیر میں یار خاں ایک اور کھوکھے پر پہنچ گئے جہاں ایک جوڑا دوکانداری

کر رہا تھا۔ دونوں ہی خوش شکل تھے مگر ظاہر ہے کہ یار خاں کو لڑکی زیادہ بھلی لگی کہنے لگے۔
"دیکھیں۔ وہ اٹلی کی فلم تھی نا۔ چاولوں والی۔ اس کی ہیروئن کی طرح ہے۔"
ان کا اشارہ "بٹرائس" کی طرف تھا۔
آئس کریم کچھ تو تھی لذیذ کچھ حالات کی سنگینی نے اور زیادہ مزیدار بنا دیا تھا۔
کون آئس کریم ہاتھوں میں تھام کر ہم نے بھی دوسروں کی طرح سڑگشت شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہر گزرنے والا (یا گزرنے والی) خوش اخلاقی سے دیکھ کر مسکراتا ہے اور کچھ نہ کچھ کہتا ہوا جاتا ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ ٹھیلے والے کھڑے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ایک صاحب تربوز بیچ رہے تھے۔ انتہائی سُرخ تربوز تھا۔ ہمارے شہروں کی طرح کٹی ہوئی قاشیں برف کی سِلوں میں لگی ہوئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ٹکڑا سو لیرا کا ہے۔ لوگ پنجابیوں کی طرح کھڑے ہو کر کھاتے اور ٹھیلے کے نیچے لگے ہوئے ڈبے میں چھلکے ڈال دیتے۔ کیا مجال جو ذرا سی بھی گندگی ہو یا مکھیاں نظر آئیں۔ فضا میں گرد و غبار کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ ہر طرف روشن روشن سماں نظر آ رہا تھا۔ ہم ان نظاروں میں کھو گئے۔ ایک جگہ ایک خوبصورت لڑکی بُھنی ہوئی پھلیوں کی قسم کی کوئی چیز فروخت کر رہی تھی۔ یار خاں نے پھلیوں سے زیادہ لڑکی سے متاثر ہو کر پوچھا۔
"ہاؤ مچ؟"
اس نے مسکرا کر انگلی اٹھا دی
"ہنڈریڈ لیرا۔"
یار خاں تو اس انداز پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ کہنے لگے۔
"یار ایک پڑیا خرید لو۔ بے چاری نہ جانے کب سے کھڑی ہوگی۔" یہ پھلیاں دیکھنے میں مونگ پھلی سے مشابہ تھیں اور اسی طرح پڑیا بنا کر فروخت کی

جا رہی تھیں جس طرح ہمارے ہاں مونگ پھلی یا چنا جور گرم فروخت کیا جاتا ہے۔ لڑکی نے اطالوی زبان میں اور بھی باتیں شروع کر دیں جو سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہمارا دل بھی پسیج گیا۔ ہم نے کہا۔

"اوکے۔ ڈان"۔ اس نے ایک پڑیا لا کر ہمارے حوالے کی۔ ہم نے لیرا کا سکّہ نکالا تو یار خاں مچل گئے۔ بولے۔

"یہ میں اسے دوں گا"۔

ان کی بچگانہ خواہش پوری کرنے کے لیے ہم نے اٹھنّی کے برابر وہ سکّہ یار خاں کو دے دیا جو انھوں نے انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر لڑکی کو پیش کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اسے ان کا یہ انداز اس قدر پسند آیا کہ پھلیوں کی ایک اور پڑیا اس نے اسی انداز میں دونوں ہاتھوں پر رکھ کر یار خاں کو نذر کی اور اشارے سے بتایا کہ یہ تحفہ ہے۔

اسی بازار میں ہمیں ایک نوجوان اور خوش پوش ہسپانوی مل گیا۔ اس نے بذاتِ خود ہمارے پاس آ کر تعارف کرایا۔ ہم نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ یار خاں سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ ہسپانوی طرز کی انگریزی میں بولا۔

"اوہو۔ آپ خان ہیں۔ پھر تو بہت بڑے آدمی ہوں گے؟"

ہم نے کہا۔

"بہت بڑی ریاست ہے ان کی۔ دس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے"۔

وہ تو بس یار خاں کا مُرید ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ساتھ گھومتا رہا۔ کبھی فلم دکھانے کی پیش کش کرتا۔ کبھی نائٹ کلب کی دعوت دیتا۔ کبھی خوبصورت لڑکیوں سے ملانے کی پیش کش کرتا۔ یار خاں کہتے رہے کہ یار۔ اس کی بھی سُن لو۔ مفت میں کھانا تو مل ہی جاتے گا۔ مگر ہم کو شک تھا کہ یہ مہربانی بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہم اس سے جان چھڑانے

کی جتنی کوشش کرتے وہ اسی قدر نتھی ہوتا۔ بار بار ہمارے ہوٹل کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ ہم نے یار خاں سے کہا۔

"خبردار۔ یہ نہ بتانا"۔

کہنے لگے۔

"کیوں۔ کیا یہ ہمارے کمرے میں بم رکھ دے گا؟"

ہم نے کہا۔

"یہ بھی بعید از امکان نہیں ہے"۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل کوششوں کے بعد بالآخر وہ حرفِ مدّعا زبان پر لایا۔ دراصل وہ حشیش، چرس اور میری جوآنا کی طلب میں تھا۔ اُس وقت تک ہیروئن اتنی مقبولِ عام نہیں ہوتی تھی مگر پاکستانیوں کے بارے میں خدا جانے کسی طرح یہ تصوّر عام ہو گیا تھا کہ وہ منشیات مہیا کر سکتے ہیں۔ ہسپانوی اس کے عوض ہمیں مُنہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھا۔ ہم نے بہترا یقین دلایا کہ بھائی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے مگر وہ بار بار یار خاں کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتا اور کہتا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گریٹ خان کے پاس بھی نہ ہو"۔

یار خاں جل بُھن کر راکھ ہو گئے۔ بولے

"کیا اس کو میں شکل سے منشیات فروش لگتا ہوں؟"

ہم نے کہا۔

"ظاہر ہے ورنہ اس طرح ریشہ خطمی کیوں ہوتا"۔

جب دیکھا کہ وہ جان چھوڑنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تو ہم نے ٹالنے کے لیے اس سے کہا کہ کل صبح دس بجے اسی جگہ ہمیں ملنا۔ ہم تمھاری دلی مُراد پوری کر دیں گے۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ ہم سب کے گالوں کو بوسہ دیا اور خان صاحب کی خدمت

میں ایک خوبصورت لائٹر پیش کیا جو یار خاں نے فوراً قبول کر لیا۔

رُوم کی رعنائیاں اور رنگینیاں اپنی جگہ مگر بھوک کے مارے بُرا حال ہوگیا تھا۔ پیسے ہمارے پاس بہت کم تھے اور وہ ہم نے ایمرجنسی کے لیے سنبھال کر رکھ لیے تھے۔ اور کھانا کھائے بغیر بھی گزارہ نہیں تھا۔ ہم ہوٹل واپس پہنچے تو مسٹر گویدو اور اینا کاؤنٹر پر موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں۔ یار خاں بولے۔

"یار دیکھو۔ ہمارے کتنے دوست بن گئے ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "جب بل ادا نہیں کرو گے پھر دیکھنا کیا سلوک کریں گے تمھارے ساتھ۔" وہ گھبرا گئے۔

"واقعی۔ یار ہمارا حشر کیا ہوگا؟"

ہم ٹہلتے ہوئے ریسٹورنٹ کی طرف چلے گئے جہاں اینا کی ایک ہمشکل سینر پر ویٹریس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ عمر اور حسن و جمال دونوں میں اس سے زیادہ تھی۔ بعد میں معلوم ہُوا اس کی بہن ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائی اور فی الفور اطالوی زبان میں باتوں کی مشین گن چلا دی۔ ہم نے کہا۔

"نو اٹیلین۔ سپیک انگلش۔"

اس نے مایوسی سے ہمیں دیکھا۔

"اوہ!"

ہم اس سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ اگر ہم ہوٹل میں کھانا کھالیں تو یہ بل ہمیں فوراً نقد ادا کرنا ہوگا یا ہمارے ہوٹل کے بل کی رقم میں شامل ہوجائے گا؟ مگر اس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ تنگ آکر ہم نے مسٹر گویدو سے مدد لینے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ موجود نہیں تھے۔ ہر چہ بادا باد کہہ کر ہم نے بطور احتیاط چائے اور روٹی مکھن کا آرڈر دیا تاکہ اگر بل نقد بھی ادا کرنا پڑجائے تو جیب پر بار نہ گزرے۔ وہ لپک جھپک چائے لے آئی

مگر دودھ ندارد۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ انگلستان کے سوا یورپ کے کسی بھی مُلک میں چائے میں دودھ نہیں پیتے۔ بڑی مشکل سے لڑکی کو دودھ کے بارے میں سمجھایا۔ کچھ تو بھُوک زیادہ چمک رہی تھی اور کچھ چائے بھی بہت لذیذ تھی۔ لُطف آگیا۔ بریڈ رول کے ساتھ مکھن کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ اور اسی سائز کے جیم کے پیکٹ بھی تھے۔ کھایا تو ان کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ یار خاں نے کہا۔

"کیوں نہ ہو۔ بالکل خالص چیزیں ہیں۔ ہم تو ملاوٹی کھا کھا کر اصلی خوراک کا مزہ ہی بھُول گئے ہیں۔"

چائے سے لُطف اندوز ہونے کے بعد یار خاں کو پینے کے لیے پانی کی خواہش ہوئی۔ ہم نے ویٹریس کو بُلایا تو یار خاں نے ہاتھ اُٹھا کر ہمیں روک دیا اور بولے۔

"بس۔ اس سے مجھے بات کرنے دو۔"

ہم نے حیران ہوکر انھیں دیکھا۔

"مگر کیوں؟"

یار خاں بولے۔

"یار اس کے سامنے انگریزی بولنے میں کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ تو مجھ سے بھی گئی گزری ہے۔"

پھر ان کے اور ویٹریس کے مابین یہ مکالمہ ہوا۔

یار خاں۔

"مائی نیم یار خاں۔ وہاٹ از یور نیم؟"

ویٹریس۔

"اطالوی زبان میں ایک لمبی تقریر اور آخر میں "جینا"۔"

یار خاں۔

"جینا۔ یُو آر بیوٹی فُل۔"

جینا شرما گئی۔ پتہ یہ چلا کہ خواتین کی تعریف خواہ کسی بھی زبان میں کی جائے وہ سمجھ جاتی ہیں۔

یار خاں۔

"یُو۔ اینا۔ سسٹرز؟"

جینا۔

"ایک طویل تقریر جس کا مطلب یہ تھا کہ "جی ہاں"۔

یار خاں۔

"آئی وانٹ واٹر۔"

جینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دس منٹ تک اُسے واٹر کے بارے میں سمجھاتے رہے۔ وہ باہر جا کر اینا اور ایک اور لڑکے کو بلا کر لے آئی مگر کوئی نہ سمجھ سکا کہ واٹر کیا بلا ہوتی ہے۔ آخر تنگ آ کر یار خاں نے کچن میں جا کر پانی کا ٹیپ دکھایا۔ وہ لوگ سمجھ تو گئے مگر حیران تھے کہ ہمیں پانی کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ برتن ہمیں نہیں دھونے، کپڑے ہمیں نہیں دھونے۔ دانت ہمیں نہیں صاف کرنے۔ شیو ہمیں نہیں بنانی پھر پانی کس لیے؟ یار خاں نے ایک گلاس اُٹھا کر لبالب بھرا اور مُنہ سے لگا کر غٹا غٹ پی گئے۔ وہ سب چیختے اور منع کرتے رہ گئے کہ یہ پانی پینے کے لیے نہیں مگر انھوں نے دوسرا گلاس بھی نوشِ جان کر لیا۔ ہم حیران تھے کہ کیا اٹلی کے لوگ پانی نہیں پیتے؟ پتہ چلا کہ طہارت کے علاوہ پانی محض دھونے دُھلانے اور شیو بنانے کے کام ہی آتا ہے۔ اگر کبھی پینے کو جی چاہے تو وہ پانی دوسرا ہے۔ اٹلی ہی نہیں سارے یورپ میں قریب قریب یہی رواج ہے۔

چائے اور مکھن روٹی کھا کر کچھ جان میں جان آ گئی تھی مگر اس خیال سے جان جا رہی تھی کہ بل کی ادائیگی کے موقعے پر ہم پر کیا گزرے گی۔ بہرحال۔ بل لانے کا اشارہ کیا

اور اس نازنین نے میز پر سے ایک کاغذ کا نیپکن اُٹھا کر اس پر کچھ لکھ کر ہمارے حوالے کر دیا۔ نو سو لیرا کے لگ بھگ بل تھا۔ ہم نے جیب سے قلم نکالا اور اسی کاغذ کے پُرزے پر دستخط کر دیئے۔ اس نے مُسکرا کر بل سنبھالا اور رخصت ہو گئی۔ یار خاں خوش ہو گئے۔ بولے "چلو۔ کھانے کی مشکل تو آسان ہوتی۔ اب رات کو خوب جی بھر کر ڈنر کھائیں گے۔"

ہم پھر ہوٹل سے نکل گئے۔ پیدل جہاں جہاں تک جا سکتے تھے گھومتے رہے ایک دو بار بس میں بھی سفر کیا۔ بسیں لوگوں سے پُر تھیں اور دیکھا کہ قطار بندی کوئی نہیں کرتا۔ ہم ایک بس میں سوار ہونے کے لیے کھڑے تھے۔ بس آئی تو ہڑبونگ مچ گیا۔ اور موٹی موٹی خواتین نے ہمیں دھکّے دے کر ہٹا دیا اور خود بس میں سوار ہو گئیں۔ کم از کم یورپ کے کسی مُلک میں ہم اس قسم کی حرکت کی توقع نہیں رکھتے تھے مگر یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ اٹلی والے بہت سی باتوں میں یورپ سے مختلف ہیں اور ہماری طرح ہیں۔ بدنظمی، شور، ہنگامہ پسندی، زندہ دِلی، کھانا پینا اور خوش باش رہنا۔ ایک منٹ میں آپ سے دوستی بنا لیں گے۔ اصول اور قاعدے قانون کو ہماری ہی طرح خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنی جیب اور رقم سے ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے ورنہ کوئی صاحب ہاتھ کی صفائی دکھا جائیں گے۔ حسبِ توفیق غلط بیانی سے کام لینا بھی بُرا نہیں سمجھتے۔ نوسر بازی کی وارداتیں بھی سیّاحوں اور اجنبیوں کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں۔ ریلوے سٹیشن اور ایئرپورٹ کے علاوہ پُر ہجوم اور بارونق بازاروں میں غیر ملکیوں کو دیکھ کر مختلف حیلوں بہانوں سے ٹھگنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کرنسی کے زیادہ اچھے دام دلانے کے بہانے بھی سیّاحوں کی حجامت بنا دیتے ہیں۔ رنگت اور نقش و نگار کے علاوہ عادتوں میں بھی یہ بہت حد تک مشرقی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مشترکہ خاندانوں کا رواج ختم ہو چکا ہے مگر اٹلی میں ابھی تک باقی ہے۔ جذباتی اور خاندانی

رشتوں کو آج بھی وہاں اہمیت حاصل ہے۔ بوڑھے ماں باپ اولاد کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ ان کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ یہ منظر میں نے صرف روم میں دیکھا کہ پُر ہجوم اور کھچا کھچ بھرے ہوئے ریستورانوں کے باہر کاروں میں پورا خاندان بھر کر آیا، بڑی بی کار میں بیٹھی رہیں، ماں باپ اپنے چھوٹے بڑے بچّوں کو سمیٹ کر ریستوران میں چلے گئے۔ بہت چھوٹی بچّی بڑی امّاں کی تحویل میں چھوڑ گئے۔ اب باری باری ریستوران کے اندر سے میاں بیوی باہر آتے ہیں اور بڑی امّاں کو کھانے پینے کا سامان پہنچاتے ہیں۔ خاندانی یکجہتی اور رشتوں کا یہ احساس اب یورپ میں معدوم ہو چکا ہے۔

روم قدیم و جدید کا امتزاج ہے اور بہت خوبصورت اور دلکش شہر ہے۔ تاریخی یادگاریں، عمارتیں، میوزیم، گرجا، فوّارے قدم قدم پر حیرت میں مبتلا کیے دیتے ہیں۔ وٹیکن میں پوپ کی رہائش ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ ایک الگ خودمختار سلطنت ہے۔ بہت مختصر لیکن آج بھی طاقت اور اختیار سے بھرپور، روم کے میوزیم تو دیکھنے کے قابل ہیں ہی مگر وٹیکن کے میوزیم بھی قابلِ دید ہیں۔ نوادرات اور عجائبات کا اتنا بڑا اور قیمتی ذخیرہ کسی اور ملک کی قسمت میں کہاں جس سے روم مالامال ہے۔ محض روم ہی نہیں، اٹلی کا گوشہ گوشہ چشمِ حیراں کے لیے عجائب کدہ ہے۔ روم کے قدیم شہر میں گھومتے تو اکثر مقامات پر قدیم لاہور یاد آ جاتا ہے۔ وہی اینٹوں کی پتلی اور تنگ گلیاں مگر ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ صاف۔ اگرچہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے معیار سے انھیں گندہ کہا جا سکتا ہے۔ پتلی اینٹوں سے بنی ہوئی قدیم عمارتیں چوک اور چوراہے۔ جن مقامات کو دُنیا بھر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے انھیں دیکھو تو نہایت معمولی نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ بوسیدہ سی کشادہ سیڑھیاں اوپر کے بازار سے نیچے کے بازار میں اُترتی ہیں۔ لیجئے یہ مشہورِ زمانہ سپینش سٹیپ ہیں۔ ایک چھوٹے

سے چوک میں وہ فوّارہ واقع ہے جو دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ روم جانے والا ہر سیّاح دیگر مقامات کی طرح اس فوّارے کی بھی زیارت کرتا ہے اور اس میں سکّے پھینکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس طرح جو بھی خواہش یا آرزو کی جاتی وہ پوری ہوتی ہے اور اس فوّارے میں جو کوئی بھی سکّے ڈالتا ہے؛ وہ دوبارہ روم ضرور آتا ہے۔ اس حد تک تو ہم بھی تصدیق کر سکتے ہیں۔ دو بار ہم نے سکّے پھینکے اور تین بار روم گئے۔ تیسری بار مصروفیت کے باعث فوّارے پر نہیں گئے۔ نتیجہ یہ کہ چوتھی بار روم کا سفر اختیار نہیں کیا۔ شاید یہ کہاوتیں بھی کسی حد تک درست ہی ہوتی ہیں!

روم کے آس پاس کے علاقوں میں بھی قدیم تاریخی یادگاروں اور باغات کا اژدہام ہے۔ ان جگہوں کو دیکھ کر اندازہ ہُوا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی طرح روم کے شاہوں کو بھی آبِ رواں، فوّاروں، حوضوں اور غسل خانوں کا شوق تھا اور اس کے لیے انھوں نے مُغلوں کی طرح بہت پیچیدہ سسٹم ایجاد کیا تھا بعض مقامات پر تو چھوٹی چھوٹی نالیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور پانی مختلف النوع فوّاروں اور جھرنوں میں رواں دواں عجیب طلسماتی منظر پیش کرتا ہے۔ روم کے لوگ تکلّف اور بناوٹ پسند نہیں کرتے۔ نظم و ضبط کی پابندی کے معاملے میں بھی ہماری طرح ہیں۔ شور شرابا اور دھکم پیل مغرب کے دوسرے ملکوں میں ناپید ہے۔ مگر روم میں عام ہے لطف یہ کہ اٹلی والے اپنی اِن عادات پر ہماری طرح قطعی شرمسار یا نادم نہیں ہوتے انھوں نے اپنی عادات، رسم و رواج اور طور طریقوں میں تبدیلی کرنے کی مطلق ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اگر کوئی ٹوکے تو شانے اُچکا کر کہیں گے۔ "تو پھر کیا ہوا؟ جانتے نہیں، ہم اطالوی ہیں"!

رات کا کھانا ہوٹل کے ریسٹوران میں کھایا اور زندگی میں پہلی بار "پیزا" چکھا۔ یار خاں اور منوّر نے اٹکل سے اطالوی کھانے منگاتے جو ان کے حلق سے نہیں اُترے

کافی پی کر شکر ادا کیا۔ پیسوں کی نقد ادائیگی کا سوال ہی نہیں تھا اِس لیے ہم
مطمئن تھے۔ مستقبل میں کیا پیش آنے والا ہے؟ اس کی فکر ہی ہم نے چھوڑ دی
تھی اور اللہ پر توکل کر بیٹھے تھے۔ شام کو پھر ہوا خوری کو نکل گئے۔ دیکھا کہ
رات کے آٹھ نو بج گئے مگر چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ سڑکوں
دکانوں اور مکانوں کی روشنیاں بھی جل گئیں۔ یہ ہمارے لیے پہلا اور انوکھا تجربہ
تھا، یورپ میں رات کا اندھیرا جسے ہم جھٹ پٹا کہتے ہیں، بہت تاخیر سے پھیلتا
ہے۔ روشنی نو ساڑھے نو بجے تک پھیلی رہتی ہے۔ انگریزی کے لفظ (TWILIGHT)
کا مطلب یہ روشنی دیکھ کر ہم پر واضح ہوا۔ یارخاں بار بار گھڑی دیکھتے اور مطلع کرتے
کہ نو بج گئے ہیں، ساڑھے نو بج گئے ہیں، دس بج گئے ہیں مگر رات نہیں ہوتی۔ آخر
خدا خدا کر کے رات ہوئی اور جگمگاتے ہوئے روم کو بجلی کی روشنیوں میں چمکتے دمکتے
دیکھا۔ رات گئے ہوٹل میں جا کر سو گئے۔

دوسرے دن علی الصبح ہماری آنکھ موٹر گاڑیوں کے شور اور ہارنوں کی بے تحاشا
آوازیں سُن کر کھُل گئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو عجب منظر تھا۔ پتلی سی سڑک
پر دو رویہ گاڑیاں پارک تھیں اور درمیانی راستے میں عین ہوٹل کے سامنے ایک
دودھ کا ٹرک اور ایک کار آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں دونوں طرف
گاڑیوں کی ایک انتہائی لمبی قطار کھڑی تھی اور سڑک پر تِل دھرنے کو جگہ باقی نہیں تھی
ہر شخص ہارن بجا رہا تھا لیکن ٹرک ڈرائیور اور کار والا ان سے بے خبر ایک دوسرے
کو قائل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ غلطی دراصل کس کی ہے؟ وہ دونوں
زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر نمبر آوازمیں ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔ کان پڑی
آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ گزشتہ روز ہم جس بارے میں سوچ رہے تھے وہ
ہونی ہو کر رہ گئی تھی۔ پتلی سی گزرگاہ پر بیک وقت آمنے سامنے سے آنے والی دو

گاڑیوں نے چشم زدن میں اپنے عقب میں حدِ نگاہ تک ایک طویل قطار کھڑی کر
دی تھی اور ہر کوئی ٹریفک میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ ہم نے یارخاں کو بھی جگا کر یہ تماشہ
دکھایا۔ ہم تو تیار ہو کر ناشتہ کرنے چلے گئے مگر یہ ٹریفک جام دو گھنٹے تک رہا۔
پولیس سائرن بجاتی ہوئی نازل ہو گئی اور اس نے خدا جانے کس طرح مشکل میں پھنسے
ہوئے لوگوں کو نجات دلائی۔

ناشتے کے بعد ہوٹل میں کچھ دیر گھومے پھرے تو ہم پر انکشاف ہوا کہ جس لڑکے
نے ہمیں ایئرپورٹ سے ہوٹل روانہ کیا تھا وہ گویدو صاحب کا بیٹا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور
بھی ان کے فرزند تھے جو ہمیں کچن میں ناشتہ کرتے ہوئے نظر آ گئے۔ گویا ایں خانہ
ہمہ آفتاب است۔ یہ کاروبار پورے خاندان کی ملی بھگت سے چل رہا تھا۔ ہم نے
یارخاں کی نظر سے بچا کر روم شہر کی تصویر والا ایک خوبصورت فوٹو کارڈ خریدا اور
اپنی اماں کو خط لکھنے کے لیے کاؤنٹر پر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے بعد بھینی بھینی خوشبو
اور گرم گرم سانسوں نے ہمیں چونکا دیا۔ دیکھا تو ہمارے پیچھے ایما کھڑی بہت غور
اور حیرت سے ہمیں چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے
گویدو صاحب سے کچھ کہا اور وہ بھی آ کر بغور ہماری تحریر کا معائنہ کرنے میں مصروف
ہو گئے۔ ہم حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر انھوں نے مُہرِ سکوت کو توڑا اور پوچھا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا تصویریں بنا رہے ہیں؟

ہم نے کہا۔

"لکھ رہے ہیں۔ یہ اُردو ہے"۔

"اُردو" وہ حیران ہو کر بولے۔

"یہ کوئی زبان ہے؟"

ہم نے بتایا کہ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ پوچھنے لگے۔

"آپ کے ہاں حروفِ تہجّی ہوتے ہیں یا چینی جاپانی کی طرح تصویریں بناتے ہیں ؟"

ہم نے بتایا کہ یہ حروف ہیں اور ہماری تحریر دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ معلومات اینا کو فراہم کر دیں۔ اسی اثناء میں جینا بھی آگئی تھی اور دونوں جھک جھک کر باری باری ہماری تحریر کو اور ہمیں دیکھ رہی تھیں اور ہم اچھے خاصے نمائشی چیز بن کر رہ گئے تھے۔ یار خاں بھی گلی میں بچّوں کی لڑائیاں اور عورتوں کے جھگڑے دیکھنے کے بعد ہمارے پاس آگئے تھے۔ کہنے لگے۔

"یار بہت اُستاد ہو۔ لڑکیوں کو متوجّہ کرنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے تم نے"

گویدو صاحب نے اینا اور جینا سے کانفرنس کی اور کہنے لگے۔

"آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ دونوں لڑکیاں آپ کو لکھتے ہُوتے دیکھنا چاہتی ہیں"

"لو، بن گئے راجہ اندر" یار خاں جل کر بولے۔

ہم نے ان کے طنز پر کان دھرے بغیر ہی باقی ماندہ خط لکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی لڑکیوں کو اُردو زبان کی باریکیاں بھی سمجھاتے رہے۔ وہ بڑی حیرانی سے ہمیں انتہائی تیزی سے چھوٹے چھوٹے، گول گول الفاظ ایک سیدھی لکیر میں لکھتے ہوتے دیکھ رہی تھیں اور ہماری کاریگری پر عش عش کر رہی تھیں۔ بعد میں انھوں نے ہوٹل میں آنے والے اور بھی لوگوں کو ہمارے بارے میں بتایا اور وہ بھی ہماری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے رہے۔ دوسرا دن پھر روم اور نواحی علاقوں کی سیر کے لیے وقف تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہم ایک بھی لیرا خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے اِس لیے ان ہی جگہوں پر گئے جہاں پیدل جا سکتے تھے اور جہاں جانے کے لیے

ٹکٹ نہیں خریدنا پڑتا تھا۔ وہ سارا دن بھی ہم نے گھومنے پھرنے میں گزارا مگر اس پلازا کا رُخ نہیں کیا جہاں ہمارا ہسپانوی مدّاح بے چینی سے منتظر رہا ہو گا۔

روم میں یہ موسمِ گرما تھا۔ روم والے موسمِ گرما بھی عجب طرح مناتے ہیں۔ گرمی ان کے ہاں اتنی ہی تھی جتنی لاہور میں اکتوبر کے آخری دنوں میں ہوتی ہے۔ کمروں اور ساتے میں موسم خوشگوار بلکہ مزیدار تھا۔ پنکھے یا ائر کنڈیشنڈ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ البتہ دھوپ تیز تھی اور کچھ دیر بھی دھوپ میں رہنا ناگوار گزرتا تھا۔ سُنا کہ روم میں موسم سرما میں برف نہیں پڑتی مگر سردی خاصی ہوتی ہے۔ گرمی میں یہاں کے لوگوں کا دن دیر سے شروع ہوتا ہے۔ دفاتر بھی نو دس بجے سے پہلے نہیں کھُلتے۔ ہوٹل اور ریسٹوران تو خیر کھُلتے ہی دس گیارہ بجے ہیں کیونکہ رات کو تین چار بجے تک کھُلے رہتے ہیں۔ دفتروں کا یہ طریقہ ہے کہ نو دس بجے کھُلے اور بارہ بجے بند ہو گئے۔ یہ روم والوں کا قیلولہ کا وقت ہے۔ بارہ بجے دن کو بازار یہاں تک کہ ریسٹوران بھی بند ہو جاتے ہیں اور تین چار بجے سے پہلے دوبارہ نہیں کھُلتے۔ دوپہر کے وقت روم کے لوگ کھانا وغیرہ کھا کر آرام کرتے ہیں۔ چنانچہ چار پانچ بجے تک کھانا پینا تو کیا دوا دارُد بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ اِکّا دُکّا دکانیں کھُلی ہوتی ہیں۔ مگر شہر میں خاصا ہنگامہ اور رونق رہتی ہے۔ سیّاحوں کی بھی اور مقامی لوگوں کی بھی۔ فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ بُوتھ بنے ہوتے ہیں جن میں ٹیلی فون لگے ہوتے ہیں۔ یہ پولیس کو اطلاع دینے کے لیے ہیں۔ اگر ہنگامی حالت میں پولیس کی خدمات درکار ہوں تو فون اُٹھا کر بات کیجئے اور پولیس چند لمحوں میں سائرن بجاتی ہوتی آجاتے گی۔ یوں بھی پولیس والے پیدل اور پولیس کاروں میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اٹلی کو ایک زمانے میں بدنامِ زمانہ "مافیا" کا ہیڈ کوارٹر کہا جاتا تھا۔ آج بھی یہ بین الاقوامی جرائم کا بہت بڑا گڑھ ہے۔ بڑے بڑے طاقت ور جرائم پیشہ گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ مگر عام شہریوں کی

زندگی خاصی پُرسکون ہے اور چوری چکاری بھی زیادہ نہیں ہے ۔ اگرچہ طبیعت ،
مزاج اور اطوار کے لحاظ سے یہ پنجابیوں سے مشابہ ہیں مگر فرق یہ ہے کہ لڑائی جھگڑا
زیادہ تر زبانی شور و غل تک ہی محدود رہتا ہے عموماً ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آتی ۔ ہماری
طرح چاقو چُھریاں اور پستول بھی نہیں چلتے ۔ اٹلی کے کھانے سارے یورپ اور امریکہ میں
میں مشہور ہیں ۔ بعد میں روم گئے تو ہم نے بھی چکھے مگر ہمارے ذوق کے مطابق نہیں تھے ۔
البتہ کچھ کھانے خاصے لذیذ اور چٹ پٹے ہوتے ہیں ۔ سادہ چاول کافی شوق سے کھاتے
جاتے ہیں ۔ بعض ڈشوں میں سادہ چاول کے ساتھ شوربے والے سالن بھی استعمال ہوتے
ہیں ۔ ہمیں تو یہی پسند آتے ۔ اٹلی کی عورتوں کے متعلق ہالی وُڈ کی فلموں نے ہمیں جو تاثر
دیا تھا وہ درست ثابت نہیں ہوا ۔ حُسن یہاں کافی ہے ۔ صحت مند ، مناسب جسم ، دراز قد ،
سیاہ بال ، سیاہ آنکھیں ، چہرے کا رنگ یورپ والوں کی طرح سفید نہیں ہوتا بلکہ اس
میں ملاحت ہوتی ہے ۔ بعض کھلتے ہوتے سانولے ہوتے ہیں ۔ مگر ہم نے وہاں عورتوں
کے مقابلے میں مرد زیادہ خوبصورت پاتے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی دُنیا کی عورتیں
اٹلی کے مردوں پر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہیں ۔ یہ باتونی اور چرب زبان بھی ہوتے ہیں ۔
یہاں کی خواتین ایک خاص عمر تک تو دُبلی پتلی رہتی ہیں مگر نوجوانی کی عمر سے گزرتے
ہی موٹاپے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں ۔ اس کی ایک وجہ ان کے مرغن اور لذیذ کھانے
بھی ہیں اور پھر خوراک بھی ماشاء اللہ کم نہیں ہوتی ۔

ویسے تو اٹلی اور روم اپنے عجائبات اور قدیم نوادر کی وجہ سے مشہور ہے مگر ایمان
کی پوچھئے تو معدودے چند عمارتوں کو چھوڑ کر ہمیں اکثر خاصی بوسیدہ اور شکستہ حالت
میں نظر آئیں ۔ زیادہ تر تو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں جنہیں حکومت نے بھی جُوں کا
تُوں چھوڑ دیا ہے ۔ اس کے باوجود زمانے بھر کے لوگ یہ کھنڈر دیکھ دیکھ کر ہی جی
خوش کر لیتے ہیں ۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں تاریخی عمارتوں وغیرہ کو نسبتاً بہت

زیادہ احتیاط سے بنا سنوار کر رکھا گیا ہے ۔ جبکہ اٹلی میں صرف وہی عمارتیں زیادہ اچھی
حالت میں نظر آئیں گی جو کمرشل مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں یا جہاں بازار اور شاپنگ
پلازا وغیرہ بن گئے ہیں ۔

اگلی بار ہم روم گئے تو دیکھا کہ وہاں زیرِ زمین ریلوے زیرِ تعمیر ہے ۔ بتایا گیا کہ چند میل
ریلوے بن چکی ہے اور زیرِ استعمال بھی ہے ۔ ہم نے دوسرے ملکوں کی انڈر گراؤنڈ میں بھی
سفر کیا تھا ۔ سوچا روم کی انڈر گراؤنڈ کا مزہ بھی چکھ لیں ۔ ٹکٹ خرید کر اندر گئے تو مقابلتاً
صفائی کی حالت خاصی خراب تھی ۔ سنگِ مرمر کا فرش تھا ، مگر میلا کچیلا ۔ ڈبے بھی زیادہ اچھی
حالت میں نہیں تھے ۔ صفائی وغیرہ کا یہ معیار روم میں ہر جگہ نظر آتا ہے ۔ ہمارے مقابلے
میں تو روم کو آئینہ خانہ کہہ سکتے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ کے دوسرے شہروں سے مقابلہ
کیجئے تو خاصی مایوسی ہوتی ہے ۔ پھر انڈر گراؤنڈ ٹرین بنانے میں انھیں مشکل بھی زیادہ
پیش آئی کیونکہ بالائے سطح عمارتیں بہت پُرانی اور بوسیدہ ہیں ۔

رات کو ہم پھر واپس ہوٹل میں پناہ گزین ہو گئے ۔ ریسٹوران میں پیٹ بھر کر کھانا
کھایا ۔ کچھ دیر روم کی پُراسرار گلیوں کی سیر کی اور پھر سونے کے ارادے سے اپنے کمرے
میں چلے گئے حالانکہ گویدو صاحب اور ان کے بیٹے بار بار اصرار کرتے رہے کہ چلئے ۔
نائٹ کلب لے چلتے ہیں ۔ بہت اچھا ہے ۔ انھوں نے نائٹ کلب کی ایسی تصویر کشی کی کہ
یار خاں تو بے چین ہو گئے اور ہمارے دل میں بھی گدگدی ہونے لگی مگر مالی حالات راہ
میں دیوار بنے کھڑے تھے ۔ شاید گویدو اور ان کے اہلِ خاندان کسی نائٹ کلب میں بھی
حصہ دار ہوں گے تبھی تو ہماری جان کھا رہے تھے ۔ ہم نے پی آئی اے کے دفتر میں
فون کر کے اپنے ہوٹل کا نمبر بتا دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ کراچی سے آنے والوں کو
ہمارے بارے میں اطلاع دے دی جائے ۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اگر انسان صبر کر لے تو پھر کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی ۔ ہم

نے بھی حالات کے پیشِ نظر صبر کی سِل سینے پر رکھ لی تھی چنانچہ بے فکر تھے۔ آرام سے سکون کی نیند سو گئے۔ رات کو (یعنی صبح کو) پانچ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہمیں جگایا۔ دوسری طرف فلم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر قدیر ملک صاحب تھے۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ انھوں نے ہمیں شارٹ ہینڈ میں اطلاع دی کہ اب شوٹنگ کا پروگرام تبدیل ہو گیا ہے۔ راشد صاحب وغیرہ پیرس میں ہیں اور فلم یونٹ بھی براہِ راست پیرس جا رہا ہے۔ ہماری نیند اور ہاتھوں کے طوطے بیک وقت اُڑ گئے۔ فوراً اُٹھ گئے اور ان سے کہا کہ بھائی ہمیں کس کے حوالے کیے جا رہے ہو؟ ہمارے پاس تو پیسے بالکل نہیں ہیں۔ وہ بولے۔

"آفاقی صاحب فلائیٹ کا اعلان ہو رہا ہے۔ مَیں تو جا رہا ہوں۔"

ہم نے کہا۔

"خدا کے لیے ہمارا کوئی بندوبست کر کے جاؤ اور پی آئی اے والوں سے بات کرا دو۔"

انھوں نے ازراہِ کرم پی آئی اے کے مینجر صاحب سے بات کرا دی۔ ہم نے ان سے کہا کہ خدارا ہم مصیبت زدوں کا کچھ کیجیے۔ اس یونٹ کو روک لیجیے۔ ان کا ٹکٹ کینسل کرا دیجیے ورنہ ہم بے سہارا رہ جائیں گے۔ کوئی جعفری صاحب تھے۔ انھوں نے تسلی دی اور کہا۔

"مَیں آپ کو فلائیٹ کے بعد فون کروں گا"

اور فون بند ہو گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔ ہماری گفتگو اُن دونوں نے بھی سُن لی تھی اور ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یار خاں بولے "یار۔ یہ تو بہت ظلم ہے۔ لگتا ہے ہمیں تو سچ مچ یہاں پلیٹیں دھونی پڑیں گی۔" دِل بہلانے کو ہم نیچے لابی میں چلے گئے۔ گویندو صاحب اونگھ رہے تھے۔ انھیں

جگا کر ہم نے چائے کی فرمائش کی اور جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھنے میں مصروف ہو گئے اس دن کئی سال کے بعد ہم نے طلوعِ آفتاب کا منظر روم میں دیکھا۔ کیا کرتے مجبور تھے سات بجے کے قریب جعفری صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ یونٹ والوں کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ایک سو ڈالر ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں اور کہا ہے کہ جیسے ہی فلائیٹ ملے پیرس آجاؤ۔ پی آئی اے کی فلائیٹ اگلے دو روز تک نہیں تھی۔ نہ ہی پین امریکن میں کوئی گنجائش تھی۔ مگر جعفری صاحب نے دن کے ایک بجے کی فلائیٹ سے سوئس ائر میں ہماری سیٹوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم نے انھیں بے شمار دعائیں دیں۔ پھر کہا کہ ہمارے پاس تو نہ ہوٹل کا بل ادا کرنے کو پیسے ہیں اور نہ ہی ٹیکسی کا کرایہ ہے۔ یہاں گروی پڑے ہوتے ہیں۔ ائرپورٹ تک کیسے آئیں؟ جعفری صاحب واقعی فرشتہ ثابت ہوتے۔ انھوں نے کہا۔

"ہوٹل والوں سے آپ میری بات کرا دیجیے اور بل بنوا کر یہاں لے آئیے۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی ائرپورٹ آ کر دے دینا۔ مَیں باہر آپ کا منتظر ہوں۔"

گویندو صاحب کو پی آئی اے پر پورا بھروسہ تھا۔ ۴۲ ڈالر کا بل انھوں نے ہمارے حوالے کیا اور ٹیکسی بھی منگوا دی۔ پتہ چلا کہ جاتے ہوتے ساڑھے چار ہزار لیرا کرایہ ہو گا کیونکہ وہاں سے ٹیکسی خالی آتی ہے اور ائرپورٹ ٹیکس بھی دینا پڑتا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر کہا۔

"ائرپورٹ سے ٹیکسی خالی کیسے آتی ہے؟"

وہ بولے۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ روم ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

بحث کرنے کا نہ وقت تھا نہ گنجائش۔ چنانچہ خون کے گھونٹ پی کر مان گئے۔ انھوں نے بڑے جوش و خروش سے جذباتی انداز میں ہمیں خدا حافظ کہا اور وعدہ

لیا کہ آئندہ کبھی اچھے حالات میں روم آتے تو اُن ہی کے مہمان ہوں گے۔

ائرپورٹ پر جعفری صاحب سو ڈالر لیے ہمارے منتظر تھے۔ ٹیکسی کا کرایہ اور ہوٹل کا بِل ادا کرنے کے بعد جو ڈالر بچے وہ انھوں نے ہمارے حوالے کر دیتے اور پھر جہاز کی روانگی تک ہمارے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔

روم کا تجربہ رُوح فرسا ضرور تھا مگر ہم نے خاصا لطف اُٹھایا تھا۔ پیرس جانے کے تصوّر سے ہماری ساری پریشانی اور کوفت دُور ہو چکی تھی۔ یار خاں نے ہَوائی جہاز کا بغور جائزہ لیا اور بولے "دیکھنے میں تو یہ بھی ویسا ہی جہاز ہے۔ عملے کے لوگ ویسے ہی گورے چٹّے ہیں۔ یار، مَیں نے نوٹ کیا ہے کہ ہر ملک کے گورے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں کو کنفیوز کرنے کے لیے مختلف ملکوں کے نام رکھ لیے ہیں۔"

ہم چُپ رہے تو کہنے لگے۔

"یار۔ مزا ہی آجاتے جو سوئس ائر کا یہ ہَوائی جہاز غلطی سے ہمیں لے کر سوئٹزرلینڈ چلا جاتے۔"

ہم نے انھیں یاد دلایا کہ ہمارے پاس چالیس ڈالر بھی موجود نہیں ہیں اور سوئٹزرلینڈ میں کسی جعفری صاحب کے ملنے کا امکان بھی مفقود ہے۔ یہ سُن کر انھوں نے ہمیں بہت ڈانٹا۔ بولے۔

"یار کیسے مسلمان ہو؟ خدا کی ذات پر بھروسہ نہیں کرتے؟ ارے جو خدا ہمیں سوئٹزرلینڈ لے کر جاتے گا کیا وہ اپنی قدرت سے ہمارے لیے وہاں ایک عدد جعفری صاحب پیدا نہیں کر سکتا؟"

جب ہم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو انھوں نے ہم سے مایوس ہو کر برابر میں بیٹھی ہوئی ایک انگریز لڑکی سے باتیں شروع کر دیں۔ ہمارے پوچھنے پر بولے "یہ آسٹریا کی ہے۔ انگریزی مجھ سے بھی کم جانتی ہے۔ تم چُپ رہو۔ مَیں ذرا اپنی انگریزی ٹھیک کر رہا ہوں۔"

پیرس جو ایک شہر ہے...

تاریخ کے ایک سُنہری باب سے نکل کر ہم دوسرے باب میں داخل ہو رہے تھے۔ یار خاں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوتے کہا۔

"یوں سمجھتے کہ آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔"

مشہورِ زمانہ پیرس کو فرانس کے لوگ پیری کہتے ہیں۔ یہ بات ہمیں پیرس پہنچ کر معلوم ہوتی۔ "ایس" کی جگہ فرانس والے "ژ" کی آواز نکالتے ہیں اور اکثر تو اسے غائب ہی کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی فرانسیسی میں "ژ" کچھ زیادہ ہی مقبول ہے اور ان کی باہمی گفتگو میں ژوں ژاں قسم کی آوازیں کثرت سے سُنائی دیتی ہیں۔ یہ زبان بے حد شیریں، ملائم اور شائستہ ہے۔ پھر ان کے بولنے کا انداز، سونے پر سہاگہ۔ چاہے ایک لفظ بھی پلّے نہ پڑ رہا ہو مگر

؎ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

پیرس کا ائرپورٹ دیکھ کر ہم رُوم سے بھی زیادہ حیران ہوتے۔ اگر وہ سیر تھا۔ تو یہ سوا سیر۔ خوبصورتی، رونق، صفائی اور آرائش کے لحاظ سے بھی اُس سے بڑھ کر اور پھر حسن و جمال اور رعنائیاں بھی یہاں زیادہ نظر آئیں۔ یہاں پہلی بار ہمیں ہوائی جہاز سے باہر آنے کے لیے ایک کیپسول کے راستے اندر ہی اندر ائرپورٹ

کی عمارت میں پہنچنے کا موقعہ ملا اس کے متعلق سُنتے تو آتے تھے مگر دیکھنے اور استعمال کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ ائرپورٹ کی طویل عمارت سے گُزر کر امیگریشن لاؤنج تک جانے کے لیے پیدل گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بجلی کے ذریعے چلنے والا ایسکلیٹر (زینہ) بھی موجود تھا۔ ہمارے لیے یہ بھی ایک انوکھی چیز تھی۔ یارخاں تو اس بجلی کی خودکار سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش میں گر بھی گئے مگر ان سے آگے چلنے والی ایک حسینہ نے انھیں تھام لیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفری بیگ دُور پھینکا اور شعر پڑھنے لگے۔

ع ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔

وہ تو خیر ہوئی کہ وہ خاتون اُردو سے نابلد تھیں ورنہ فساد برپا ہو جاتا۔ ہم نے ایک طرف لے جاکر یارخاں کو سمجھایا کہ بھائی۔ یہاں تو قدم قدم پر آپ کو اس قسم کے چہرے اور اس قسم کے مواقع ملیں گے۔ آپ اپنی شاعرانہ اور عاشقانہ حرکتوں سے باز رہیں ورنہ بلا وجہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ خود بھی نکّو بنیں گے اور ہمیں بھی بنائیں گے۔ وہ ایک آہِ سرد کھینچ کر رہ گئے۔

یوں تو روم بھی یورپ میں ہے اور ہم نے وہاں یورپ کی پہلی جھلک دیکھ لی تھی مگر روم کی مغربیت میں کچھ کچھ مشرقی انداز بھی ہے۔ یوں کہتے کہ اٹلی والے پورے صاحب لوگ نہیں ہیں۔ پیرس پہنچے تو دیکھا کہ ہر چیز کچھ بڑھ چڑھ کر ہی تھی فرانس کے لوگوں کے بارے میں جیسا سُنا تھا انھیں ویسا ہی پایا۔ یعنی خوش جمال، خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش لباس۔ دوسرے ملکوں میں لوگ تن ڈھانپنے کو کپڑے پہنتے ہیں۔ مگر فرانس کے لوگ جامہ زیبی کی خاطر لباس استعمال کرتے ہیں۔ پیرس کی سڑکوں پر عام لوگ بھی خوش لباسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوتے نظر آتے۔ اور خواتین۔! ان کا تو کچھ نہ پوچھئے۔ کچھ تو قدرت نے انھیں نزاکت، نفاست اور حُسن سے نوازا ہے کچھ وہ اپنی جدّتِ طبع اور لطافت سے اس میں اضافہ کرلیتی ہیں۔ خوشبو کا استعمال

تمام یورپ کی خواتین کرتی ہیں مگر پیرس میں دیکھا کہ فرانس کی خواتین اس کا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔ اور کیونکہ خواتین کی تعداد بھی کافی ہے اس لیے ہر سڑک، بازار گلی، دوکان، سینما ہاؤس، باغ میں خوشبو کے جھونکے مسلسل آپ کے پاس سے ہو کر گزرتے رہتے ہیں اور مشامِ جان کو معطّر کرتے ہیں جس کی وجہ سے پیرس کی سڑکیں اور بازار خوشبو میں بسے رہتے ہیں۔

فرانس والوں کی خوش گفتاری اپنی جگہ مگر یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان بولنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی سے تو انھیں کد ہے۔ اگر سُننے والا فرانسیسی نہ جانتا ہو تو وہ ان کا منہ ہی دیکھتا رہ جاتے گا۔ پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ بعد میں ہم نے فرانس کے اور بھی سفر کیے اور وہاں آنے جانے والوں سے بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ سب کا یہی خیال ہے کہ فرانس والے زبان اور کلچر کے معاملے میں بہت متعصب ہیں۔ انگریزی تو جان بوجھ کر نہیں بولتے۔ ان کی کوشش اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کے ملک میں آنے والا ان کی زبان سے واقف ضرور ہو ورنہ خصماں نوں کھاتے۔ یعنی اپنے رِسک پر آتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فرانس میں دُنیا بھر سے سیّاح بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں اور ان کے لیے بہت بڑی کمائی کا ذریعہ بھی ہیں۔ لیکن فرانس کے لوگ کاروباری مصلحت کے پیشِ نظر بھی انگریزی سیکھنا یا بولنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر یہ بھی دیکھا کہ ایک صاحب انگریزی جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر فرانسیسی بول رہے ہیں اور جب آپ ان سے انگریزی میں مخاطب ہوتے ہیں تو شانے اُچکا کر کہہ دیتے ہیں۔ "میخسی"! فرانس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یوں تو سرتاپا فرانسیسی زبان سے شرابور ہونا پڑتا ہے مگر سب سے زیادہ جس لفظ سے واسطہ پڑتا ہے وہ یہی ہے۔ یعنی "میخسی"۔ یہ دراصل انگریزی لفظ MERCY ہے جو فرانسیسی میں بھی مستعمل ہے مگر یہ لوگ "ر" بھی بہت مشکل سے بولتے ہیں اس لیے "ر" کی

جگہ "خ" کی آواز نکلتی ہے چنانچہ مرسی تبدیل ہو کر مجنسی ہو گیا ہے۔ یہ لفظ کئی معنوں
میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی انگریزی کے ایکسکیوزمی کی جگہ بھی یہی، معاف کیجئے کی
جگہ بھی یہی، سوری کی جگہ بھی یہی، مجھے نہیں معلوم کی جگہ بھی یہی زحمت فرمائیے کی جگہ
بھی یہی غرضیکہ اس کے معنی بے شمار ہیں۔ فرانس والے اس لفظ کو اتنی خوبصورتی سے
ادا کرتے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ فارسی کی مانند فرانسیسی بھی میٹھی اور شائستہ زبان
ہے اور جدید فارسی کی طرح اس زبان کی ادائیگی اور لب و لہجہ بھی انتہائی شیریں
اور ملائم ہے۔ ہمارا تو یہ عالم تھا کہ دو خواتین یا مرد آپس میں بحث کر رہے ہیں یا
جھگڑ رہے ہیں اور ہم کھڑے سُن رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عام طور
پر لوگ نرم اور دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ اکثر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
سرگوشی میں راز و نیاز کر رہے ہیں مگر یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔ کاروبار کی گفتگو
بھی اسی انداز میں کی جاتی ہے۔

خیر۔ یہ تو برسبیل تذکرہ تھا۔ پیرس کے اورلی ائر پورٹ کی عمارت میں امیگریشن
کے مرحلے سے گزر کر ہم ائر پورٹ کی طویل و عریض اور عالیشان عمارت میں پہنچے تو
سامنے کھڑے راشد مختار صاحب اور پرویز ملک صاحب کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی
کسٹم والوں نے بھی ہمارے ساتھ بہت خلوص اور شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ دراصل
اُس زمانے میں دنیا زیادہ پُرسکون اور با اخلاق جگہ تھی۔ ویزا کی سختیاں بھی زیادہ
نہیں تھیں، نہ ہی کسٹم والے یوں گھورتے تھے جیسے کچّا ہی چبا جائیں گے۔ پاکستانیوں
کے ساتھ اس وقت تک امتیازی سلوک بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ اس وقت
تک ہمارے اہلِ وطن نے بہت بڑی تعداد میں ملک سے باہر جانا شروع نہیں کیا
اس لیے غیروں کو شکایت کا موقعہ بھی نہیں ملا تھا۔ سمگلنگ میں ہم پاکستانیوں نے
بدنامِ زمانہ حیثیت بعد میں حاصل کی اُس وقت تک اس میدان میں بھی ہماری شہرت

نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں بیرونی دنیا میں پاکستانیوں
کو دوسرے غیر ملکیوں کے مساوی حیثیت دی جاتی تھی۔ بعد میں تو ہر کوئی ہم لوگوں پر
شک و شبہ کرنے لگا، ویزا کی پابندیاں سخت سے سخت ہو گئیں، کسٹم والوں نے خصوصی
نظر رکھنی شروع کر دی۔ عام پاکستانیوں کے ساتھ یورپ والوں کا سلوک بھی کچھ
تحقیر آمیز اور شک و شبہ سے لبریز ہو گیا۔ مگر شروع میں ایسا نہ تھا۔ بعد میں جو بھی
تاثر ہمارے بارے میں قائم کیا گیا اس میں زیادہ تر قصور ہمارا اپنا ہی ہے۔ ہم
نے خود ہی اپنی حرکتوں سے دوسروں کو اپنے بارے میں خراب رائے قائم کرنے کا
موقعہ فراہم کیا۔ وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔

پیرس ائر پورٹ نے ہمیں اتنا مسرور کر دیا تھا کہ سارے گلے شکوے بھول کر
ہم راشد صاحب اور پرویز صاحب سے بغلگیر ہو گئے۔ ائر پورٹ کی عمارت سے باہر
نکلے تو ایک وسیع میدان میں حدِ نگاہ تک کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جانب ٹیکسیاں
تھیں۔ راشد صاحب اپنی ٹیکسی میں آتے تھے جو فلم یونٹ کے لیے خاص طور پہ حاصل کی
گئی تھی۔ ٹیکسی کے طور پر ہم نے روم میں بھی بہت اچھی کاریں استعمال ہوتے ہوئے
دیکھی تھیں مگر پیرس میں تو ہر کار نئی، چمکیلی اور قیمتی تھی۔ ہماری ٹیکسی مرسڈیز کار تھی
اور بالکل نئے ماڈل کی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا تو ساری کوفت دُور ہو گئی۔ یہ ایک
حسین و جمیل، نازک اندام نوجوان خاتون تھیں جو خوشبوؤں میں مہکی ہوئی تھیں۔ راشد صاحب
نے بتایا کہ ان کا نام "نکول" ہے، شادی شدہ مگر اب طلاق یافتہ ہیں، دن میں ایک
ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہیں اور شام کو ٹیکسی چلاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ
بولتے راشد صاحب نے فوراً اُردو میں ہمیں مطلع کیا کہ ہوشیار۔ یہ انگریزی بھی جانتی
ہیں۔ دراصل ان کی انگریزی دانی کی بنا پر ہی راشد صاحب نے دورانِ قیام مستقل طور
پر ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ نکول کی وجہ سے بہت سے کام آسان ہو گئے۔ وہ

پیرس، مقامی طور طریقوں، مقامات اور دفتری کارروائیوں سے بخوبی واقف تھیں ا
ان کی وجہ سے بہت سی مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ ورنہ پیرس میں کسی دفتر میں جا کر حا
دل سنانا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انگریزی سمجھنے والا ہی دستیاب نہیں ہوتا
نکول سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ انھوں نے سنہری زلفوں کو جھٹکا دیا اور اپنا خوشبو
ہاتھ مصافحے کی خاطر ہماری طرف بڑھا دیا۔ پھر بتایا کہ انھوں نے پاکستان بھی دیکھا
اور لاہور میں بھی قیام کیا ہے۔ لاہور کی وہ بہت مداح نکلیں۔ خاص طور پر یہاں ک
پاکستانی کھانوں نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ اگرچہ زیادہ مرچوں سے شاکی تھیں مگر شیر
کے کھانے کا لطف وہ نہیں بھول سکی تھیں۔ یعنی ان کے اور ہمارے درمیان ایک
تعلق بھی نکل آیا۔ بعد میں یہ دستور رہا کہ ہم ان سے پیرس کی تعریفیں کرتے رہے او
لاہور کے گن گاتی رہیں۔ اس طرح حساب برابر ہو گیا۔

پیرس کا اورلی ائرپورٹ بھی شہر سے کافی دور ہے۔ بعد میں وہاں ڈیگال ائرپو
بھی بن گیا جو اورلی سے زیادہ خوشنما اور شاندار ہے۔ اگلے سفر پر ہم ڈیگال ائرپور
پر بھی پہنچے تھے۔ ائرپورٹ سے نکلتے ہی ہم نے دیکھا کہ ہم جس سڑک پر جا رہے ہیں ا
کے اوپر ایک ہوائی جہاز لینڈ کر رہا ہے۔ سڑکوں پر سڑکیں تو ہم روم میں بھی دیکھ چکے ت
مگر سڑک پر ہوائی جہاز لینڈ کرنے کا تماشہ پیرس ہی میں دیکھا۔ جگہ اور گنجائش کی کم
وجہ سے یورپ والوں نے یہ سب طریقے نکالے ہیں کہ جہاں ایک سڑک بن سکتی تھی وہ
اوپر تلے کئی سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے۔ چنانچہ سڑکیں بھی کئی کئی منزلہ ہیں۔ زمین ک
اندر بھی انھوں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ سرنگیں کھود کر ان میں سڑکیں بنا دی ہ
انڈرگراؤنڈ ٹرینوں کے علاوہ سارے یورپ میں زیرِ زمین ایک الگ دنیا آباد ہے
عمارتوں کی کئی کئی منزلیں، دفاتر، دوکانیں، کار پارکنگ، سینما گھر، کمرشل پلازا،
جانے کیا کیا زمین کے اندر کئی منزل گہرا چلا گیا ہے۔ لندن میں دریائے ٹیمز کے نیچے

سے انڈر گراؤنڈ ٹرین گزرتی ہے۔ اب تو انگلش چینل کے اندر ہی اندر انھوں نے
انگلستان اور فرانس کو ملانے کے لیے سڑک اور ٹرین بھی بنا دی ہے۔ لندن میں بھی ہم
نے دیکھا کہ قریب قریب ہر عمارت کئی کئی سو فٹ تک زمین کے اندر ہے۔ پھر ٹرینوں کا
بھی ایک جال بچھا ہوا ہے۔ گویا شہر بالکل کھوکھلا ہے مگر بے انتہا مضبوط اور پائیدار۔
پھر ہمیں خیال آیا کہ ہم نے بھی کراچی اور لاہور میں سڑکوں پر ایک دو مقام پر چند
فٹ طویل انڈر گراؤنڈ راستے بنانے کی کوشش کی تھی جو سالہا سال تک زیرِ تعمیر رہے۔
بعد میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے یا گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بن گئے اور استعمال کے
قابل نہیں رہے۔ دنیا بھر میں اوور ہیڈ سڑکیں، پل اور راستے ہر بڑے شہر میں بن گئے
ہیں۔ ۷۴ء میں ہم نے قاہرہ میں بھی ایسے راستے دیکھے تھے۔ بنیادی طور پر یہ ٹریفک
کا مسئلہ حل کرنے کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں لیکن شہروں کی خوبصورتی اور زیبائش میں
بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ٹریفک اور آبادی کا ہجوم ہمارے ملک میں بھی ہے مگر آج تک
پاکستان کے کسی ایک شہر میں بھی اوور ہیڈ برج یا سڑکیں نہیں ہیں۔ حالانکہ دوسرے کئی
ترقی پذیر اور غریب ملکوں کے شہروں میں بھی یہ موجود ہیں۔

ہم پیرس کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہوٹل کی طرف جا رہے تھے اور شہر کے مناظر،
در و دیوار اور باغات کو دیکھ دیکھ کر حیران اور مسرور ہو رہے تھے۔ پیرس میں ایک عجیب
فرحت بخش اور دل خوش کن احساس ہوتا ہے۔ یہ شہر آنے والوں کو مسحور کر لیتا ہے۔ کم از کم
ہمارے ساتھ تو یہی واردات گزری۔ ہم نے اس کے بعد بے شمار ملکوں کے سفر کیے، درجنوں
شہر دیکھے مگر جو حسن، خوبصورتی، دلکشی اور انوکھا پن پیرس میں پایا وہ کہیں اور نظر نہ آیا۔
شاید اسی لیے یہ کہاوت مشہور ہے کہ دنیا میں ہر شخص کے دو وطن ہوتے ہیں۔ ایک اس
کا آبائی وطن اور دوسرا پیرس۔ واقعی اس شہر میں پہنچ کر بہت اپنائیت اور گرمجوشی کا
احساس ہوتا ہے۔ یہ آنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ بعد میں ہم نے پیرس اور

فرانس میں بہت کچھ دیکھا مگر پہلا ہی تاثر حواس باختہ کر دینے والا تھا۔ روم کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ صاف ستھرا اور آراستہ شہر ہے۔ ٹیکسی سے گزرتے ہوتے جتنا کچھ دیکھ پاتے اس نے احساس دلا دیا کہ اس شہر کی شان، نظم و ضبط، صفائی، خوبصورتی اور چمک دمک قابلِ دید ہے۔ اس کے مقابلے میں روم خاصا گندہ اور پُرانا پُرانا سا لگا۔ ٹریفک کی پیرس میں بھی بہتات تھی۔ بعض سڑکوں پر پانچ پانچ یک طرفہ قطاروں میں دو رویہ ٹریفک رواں تھا لیکن انتہائی نظم کے تحت، روم والی افراتفری موجود نہیں تھی۔ ہارن کا شور بھی نہیں تھا۔ کسی اور قسم کے شور و غل کا تو سوال ہی نہیں۔ عمارتیں ایسی چمکیلی، نکھری نکھری کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ پیرس میں بھی قدیم طرزِ تعمیر اور قدیم عمارتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ کہنے کو یہ بھی ایک پُرانا شہر ہے مگر شہر کا کوئی بھی حصہ دیکھ لیجئے۔ کیا مجال جو پُرانے پن یا بوسیدگی کا احساس ہو جاتے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی بالکل نیا تعمیر ہُوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزوں (اور دوسروں) کے برعکس فرانس کے لوگ اپنے شہروں (اور دیہاتوں) کی عمارتوں پر باقاعدگی سے رنگ و روغن کرتے رہتے ہیں اور ہر چیز کو چمکا کر رکھتے ہیں۔ سڑکیں، بازار، عمارتیں، چوراہے، قدیم گرجاگھ مجسّمے جس چیز کو دیکھئے آئینے کے موافق چمکتی ہوتی۔ اکثر سڑکیں پتھروں سے بنی ہوتی ہیں۔ یعنی پتھروں کے یکساں اور ہموار ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں مگر اس قدر خوبصورت اور ہموار کہ سفر کرنے میں لطف آ جاتا ہے۔ ذرا سا بھی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا اور ٹریفک یوں لگتا ہے جیسے پانی میں تیرتا ہُوا گزر رہا ہے۔ پیرس کی سڑکوں پر دو رویہ درختوں کا خصوصی اہتمام ہے اور درخت بھی یکساں فاصلے پر ایک ہی سائز میں ترشے ہوتے (ہمارے لاہور میں تو اچھے خاصے درختوں کو خصوصی طور پر کاٹ دیا گیا ہے) اور ان کی آبیاری یہاں تک کہ ان کو دھونے اور نہلانے کا بھی باقاعدہ انتظام ہے جس کی وجہ سے یہ درخت اور ان کے پتّے ایسے سبز اور تر و تازہ لگتے ہیں جیسے

غسل کے بعد کوئی حسینہ۔ درختوں کو نہلانے کا باقاعدگی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑکوں کی ہر روز دُھلائی بھی ہم نے پیرس ہی میں ہوتے ہوتے دیکھی۔ ہم نے سُنا تھا کہ پیرس میں شیشے کی سڑکیں ہوتی ہیں۔ دراصل سڑکیں تو سیمنٹ، پتّھر اور تارکول ہی کی ہوتی ہیں مگر دیکھ بھال کی وجہ سے ہر دم چمکتی نظر آتی ہیں۔ شاید اسی لیے یہ تاثّر عام ہو گیا ہو۔ شہر کی خوبصورتی، صفائی اور دلکشی محض حکومت یا کارپوریشن کی ذمّہ داری نہیں ہے بلکہ شہری بھی اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پیرس والوں کو اپنے شہر پر ناز ہے اور وہ اس کی تعریف و ثنا کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ تعریف و توصیف ہم بھی اپنے شہروں کی بہت کرتے ہیں۔ ان سے محبّت بھی کرتے ہیں مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتے۔ لاہور والے اپنے شہر پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں مگر اس شہر کی خوبصورتی اور صفائی کی خاطر وہ اُنگلی تک ہلانا پسند نہیں کرتے۔ ہاں، اعتراض ہر طرح کے سُن لیجئے مگر گھروں کی گندگی اور کوڑا کرکٹ ہر کوئی دروازے کے باہر ہی پھینکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شہروں کے لوگ اپنے شہروں کی نگہداشت بھی کرتے ہیں اور انھیں صاف ستھرا اور خوبصورت رکھنے میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ پیرس والوں کی نفاست اور احساسِ ذمّہ داری کا اندازہ یوں لگائیے کہ ہمارے قیام کے زمانے میں ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک صاحب نے بلدیہ کو فون کر کے بہت ڈانٹا کہ میرے درخت کو دو دن سے غسل نہیں دیا گیا ہے۔ ہُوا یہ تھا کہ ان کے فلائیٹ کے سامنے والا درخت، جسے وہ اپنا ذاتی درخت تصوّر کرتے تھے کسی ناگزیر وجہ کی بناء پر ایک دن اسے دھویا نہیں گیا تو انھوں نے سارا شہر سر پر اُٹھا لیا۔ فخر تو روم والے بھی اپنے شہر پر بہت کرتے ہیں مگر شہر کے چپّے چپّے اور ذرّے ذرّے سے دیوانگی کی حد تک محبّت، فخر و انبساط اور اس کی دیکھ بھال کا جو جذبہ ہم نے پیرس والوں میں دیکھا وہ کہیں اور نہیں پایا۔

ہوٹل پہنچے تو پیرس کی ایک جھلک دیکھ چکے تھے اور گُم صُم رہ گئے تھے۔ شہر ایسے بھی ہوتے ہیں ؟ یہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ ہوٹل پہنچ کر یار خاں اور منوّر ہم سے جُدا ہو گئے۔ دراصل ان کا شعبہ اور محکمہ علیحدہ تھا۔ اِس لیے پھر قیام بھی ہم سے علیحدہ رہا۔ اس طرح ہم یار خاں جیسے رفیق کے ساتھ سے محروم ہو گئے۔

پیرس میں فلم کا پورا یونٹ ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور تین مختلف ہوٹلوں میں مقیم تھا جو آس پاس ہی تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ سیّاحوں کا موسم تھا اور ہم لوگ پیشگی اطلاع اور بکنگ کے بغیر اچانک ہی پہنچ گئے تھے اِس لیے جہاں بھی جگہ ملی ٹھہر گئے۔ یورپ کے دوسرے شہروں میں بھی ہمیں اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ہوٹل میں بیشتر لوگ مقیم تھے وہ بہت بڑا تھا جب کہ راشد صاحب، پرویز صاحب اور مجھے ایک قریبی چھوٹے سے ہوٹل میں جگہ ملی۔ مگر بعد میں معلوم ہُوا کہ جہاں تک ہوٹلوں کی صفائی، سروس اور دیکھ بھال کا تعلق ہے وہ ہر ہوٹل میں یکساں ہے۔ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ چھوٹے ہوٹلوں میں عموماً مالک ہی سارے فرائض سرانجام دیا کرتے ہیں۔ اور اِن میں شان و شوکت اور آرائش کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہوتی۔

ہمارے ہوٹل کی مالکہ ایک گداز جسم کی ادھیڑ عمر، گوری چٹّی خاتون تھیں۔ بلکہ انھیں سُرخ و سفید کہنا زیادہ درست ہوگا۔ باتونی تو سارے ہی فرانس والے ہوتے ہیں مگر یہ کچھ زیادہ ہی باتونی تھیں اور خاصی ہنس مکھ بھی۔ انگریزی ان کی واجبی ہی تھی مگر اپنی بات سمجھ اور سمجھا سکتی تھیں۔ ہم پیرس پہنچے تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر سوائے پانی کے اس بارش میں کوئی خاص بات نہیں یعنی نہ سڑکوں پر جھیلوں کا سماں، نہ کیچڑ، نہ غلاظت، یورپ کے ملکوں میں بارش بہت کثرت سے اور عموماً اکثر ہوتی رہتی ہے مگر پانی کے نکاس کا بندوبست ایسا ہے کہ کیا مجال جو سڑک پر پانی کھڑا ہو جائے۔ ہمارے ہاں اگر اس سے نصف بارش بھی ہونے لگے تو شہر کے شہر اس میں ڈوب جائیں اور کاروبارِ

زندگی بالکل ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ ہوٹل کی مالکہ میڈم کارلو نے کھڑے کھڑے ہی ہمارا سارا احوال پوچھ لیا اور کمرے کی چابی ہمارے حوالے کرتے ہوئے پیرس کی خاص خاص باتیں اور موسم کا احوال بھی سُنا دیا۔ پھر ہمدردی سے کہنے لگیں۔

"شدید اور مسلسل بارش کی وجہ سے شوٹنگ رُکی ہوئی ہے۔ بہت نقصان ہو رہا ہے تمھارے دوستوں کا۔ مگر میری پیش گوئی سُن لو۔"

ہم نے کہا۔

"فرمایئے !"

بولیں۔

"تُومارو ازسَن" (یعنی کل سورج نکلے گا)، ہم نے خوش ہو کر فلم ساز راشد مختار کی جانب دیکھا۔ وہ ہنس کر اُردو میں بولے۔

"اِس چھوٹی کی باتوں پر یقین مت کرنا۔ یہ پچھلے چار دن سے ہمیں یوں ہی تسلّیاں دے رہی ہے۔"

اور واقعی اگلے تین دن بھی بارش کی نذر ہو گئے اور ہم لوگوں نے گھومنے پھرنے کے سوا اور کچھ کام نہیں کیا۔ پانچویں دن سورج نکلا تو میڈم کارلو نے بڑے فاتحانہ انداز میں ہمیں دیکھا اور بولیں۔

"دیکھا۔ مَیں نہ کہتی تھی کہ کل سورج ضرور نکلے گا ؟"

پیرس کی خوبیاں تو سبھی بیان کرتے ہیں۔ بہتر ہو اگر ہم وہاں کی قباحتیں پہلے بیان کر دیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو زبان کا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یا تو ہم گونگے بہرے ہیں یا گونگے بہروں کے شہر میں آ گئے ہیں۔ اقبال نے کہا کہ

؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہی معاملہ پیرس والوں کے ساتھ ہے کہ بڑی مشکل سے کوئی انگریزی جاننے والا ملتا ہے۔

کئی بار تو اتنے زِچ ہوتے کہ اُلجھن ہونے لگی۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ آپ انگریزی میں کوئی پتہ پوچھیں گے تو وہ سمجھیں گے ہی نہیں۔ وجہ یہ کہ فرانسیسی زبان میں اس کا تلفظ کچھ اور ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایفل ٹاور بھی نہیں سمجھتے۔ شانز ے لیزے پیرس کی مشہور عالم سڑک کا نام ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ کسی اور طرح لکھا جاتا ہے۔ فرانس والے اسے کسی اور انداز سے بولتے ہیں۔ آپ لاکھ دریافت کرتے رہیں کوئی نہیں بتائے گا۔ اور جو وہ بتائے گا وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ تیسری بار جب ہم اپنے اہل خانہ کے ساتھ پیرس گئے تو ہماری دو سالہ بچی پارو بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ایک دن تو وہ صبر کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتی رہی کہ کسی ایک جگہ کا پتہ دریافت کرنے کے لیے ہم درجنوں بلکہ سینکڑوں آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شانے اُچکا کر اور "میخیسی" کہہ کر گزر جاتا ہے۔ دوسرے دن بھی جب یہی تماشہ دیکھا تو وہ ہم سے پوچھنے لگی۔

"پاپا۔ آپ ایسی جگہ آتے ہی کیوں ہیں جہاں کوئی آپ کی بات نہیں سمجھتا؟"

پارو اپنی جگہ صحیح تھی مگر وہ یہ حقیقت جاننے کے لیے ابھی بہت کم سن تھی کہ پیرس کا دیدار کرنے کے لیے یہ پریشانی مہنگا سودا نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو اکثر پیش آیا کہ ہم دکاندار خاتون سے مانگ کچھ رہے ہیں اور وہ دے کچھ رہی ہیں۔ ایک بار ہم نے ڈبل روٹی اور مکھن خریدنے کا ارادہ کیا۔ ڈبل روٹی تو سامنے رکھی ہوئی تھی اشارہ کرنے پر مل گئی۔ اب ہم خاتون کو بہتیرا سمجھا رہے ہیں کہ ہمیں مکھن درکار ہے مگر انگریزی میں کہنے اور اشاروں سے سمجھانے کے باوجود وہ حیران ہوتی رہیں اور مختلف چیزیں لا کر ہمیں تھماتی رہیں۔ ہم نے ایک ہاتھ کے اشارے سے ہتھیلی پر چھری سے مکھن لگانے کا اشارہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر مسکرائیں اور دوڑ کر اندر سے صابن کی ٹکیہ اُٹھا لیں۔ اسی طرح چھوٹی دکانوں پر رقم کے بارے میں بھی غلط فہ

پیدا ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی میں وہ ہندسوں کو کسی اور انداز میں بولتے ہیں غرضیکہ خاصی جھک جھک رہتی ہے۔ راشد صاحب کے والدین جس بڑے ہوٹل میں مقیم تھے اس میں پانچسو سے زائد کمرے تھے اور بڑے ہوٹلوں والا سارا تام جھام موجود تھا۔ مگر انگریزی بولنے والے وہاں بھی سارے سٹاف میں مشکل سے دو تین ہی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ٹیلی فون آپریٹر انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتی تھی۔ یہاں تک کہ روم نمبر تک نہیں سمجھ سکتی تھی۔ ایک بار ہم اس سے نمبر مانگ رہے تھے جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے ایک نمبر ملا دیا۔ ہم نے ہیلو کہا تو دوسری جانب سے کسی نے بڑی نستعلیق اردو بولنی شروع کر دی۔ ہم تو حیران ہی رہ گئے۔ پتہ چلا دوسری جانب بھی ایک صاحب بہت دیر سے کوئی نمبر طلب کر رہے تھے جو آپریٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے دونوں انگریزی بولنے والوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔

ہم پاکستان سے چلے تو جون کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ روم میں موسم خوشگوار تھا مگر پیرس میں تو باقاعدہ سردی تھی اور ہم لوگ ہیٹر جلانے پر مجبور تھے۔ بارش نے خنکی زیادہ کر دی تھی۔ دھوپ بھی نکلی تو سردی میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی مگر ہم نے اُجلا اُجلا پیرس سورج کی شعاعوں میں چمکتا ہوا دیکھ لیا۔ سورج نکلتے ہی یوں لگا جیسے ہر چیز بدل گئی ہو۔ سبزہ، عمارتیں، سڑکیں، مجسمے، باغات، ہر چیز نگاہوں کو خیرہ کرنے لگی۔ شانزالیزے گئے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی سڑک ہے سڑک تو خیر بہت کشادہ ہے ہی لیکن اس کے دونوں طرف فٹ پاتھ بھی سڑک سے کم کشادہ نہیں ہیں۔ اور پھر نہایت صاف شفّاف اور خوبصورت۔ سڑکوں کے کنارے ریسٹوران ہم نے روم میں بھی دیکھے تھے مگر پیرس میں اس کا رواج زیادہ ہی پایا۔ اور شانزالیزے کے فٹ پاتھ تو غالباً بناتے ہی اس مقصد کے لیے گئے ہیں۔ دو رویہ فٹ پاتھوں پر بے شمار لوگ گھومتے پھرتے ہیں اور لب سڑک ریسٹوران میں دم لینے اور

تازہ دم ہونے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ زنگا رنگ کے لوگ دیکھ لیجئے۔ قسم قسم کے لباس، بنت نئی زبانیں بولنے والے لوگ۔ حسن و رعنائی ایسی جیسے مسلسل اور مستقل فیشن پریڈ ہو رہی ہو۔ پیرس کی کسی بھی سڑک کے کنارے ریسٹوران میں بیٹھ جائیے۔ سامنے کافی کی پیالی رکھ لیجئے اور گھنٹوں بیٹھے تماشہ دیکھئے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُکتاہٹ نہیں ہوتی پیرس میں حسن و جمال بے اندازہ ہے۔ مگر یہاں ہمیں نسلی امتیاز مطلق نظر نہیں آیا۔ بلکہ اس کے برعکس ہم کالے مردوں کے بازو میں بازو ڈالے گھومنے والی سفید فام اور خوش جمال خواتین کو بہت حیرانی سے دیکھتے رہے۔ اسی فٹ پاتھ کے ایک ریسٹوران میں ہم نے دُنیا کی سب سے خوبصُورت لڑکی کو دیکھا۔ کم از کم ہماری نظروں سے ایسی حسین و جمیل لڑکی نہ گزری تھی نہ گزری ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ کہ وہ ایک کالے کلوٹے افریقی کے ساتھ گھوم رہی تھی اور بظاہر وہ صاحب مالدار بھی نظر نہیں آتے۔ ایک اور حقیقت جو یورپ (اور امریکہ) میں ہم پر منکشف ہوئی وہ یہ تھی کہ عورتوں کی خوبصورتی اور دولت لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ مغربی معاشرے میں حُسن کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بیحد عام ہے۔ ہوٹلوں میں ویٹریس، دکانوں میں سیلز گرل، دفتروں میں کلرک جیسے دیکھئے ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت اور پُرکشش مگر ان کی خوبصورتی ان کی مادّی خوشحالی کا سبب مطلق نہیں ہے۔ خوبصورتی کو ہم نے وہاں ایک غیر اہم چیز پایا۔ ہمارے ملک میں ذرا سی خوش شکل لڑکی بھی غرورِ حسن میں مبتلا ہو جاتی ہے اور خوبصورتی کو لڑکیوں کی خوشحالی اور خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ محض خوبصورت چہرہ بہت زیادہ مراعات حاصل کر لیتا ہے۔ مگر مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ حسین ترین لڑکیاں انتہائی معمولی ملازمتیں کرتی ہیں اور خوشحال، دولت مند اور خوب صورت لڑکیاں بھی خاصے بدحال اور میلے کچیلے بدشکل لڑکوں کے ساتھ گھومتی نظر آتی ہیں ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ حُسن بہت عام ہے۔

پیرس کے دن بھی حسین ہیں اور راتیں بھی۔ پیرس کو بجا طور پر روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں ایک "روشنیوں کا چوک" بھی ہے۔ یہ انتہائی وسیع و عریض چوک ہے اور بجلی کے قمقموں سے جگمگاتا رہتا ہے۔ رات کو ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر مشاہیر کے مجسّمے جگہ بجگہ ایستادہ ہیں۔ بعض سُنہری ہیں اور ایسے چمکتے ہیں جیسے ابھی ابھی کوئی سُنار بنا کر گیا ہے۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کا پہلا تجربہ زندگی میں ہمیں پیرس ہی میں ہوا۔ ٹرینیں بے حد سُبک اور خوبصورت اور انڈر گراؤنڈ سٹیشن ان سے بھی زیادہ خوبصورت اور آراستہ۔ لوگ بھی نظم و ضبط اور شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انتہائی رش کے اوقات میں بھی دھکم پیل نہیں ہوتی. کسی بھی قوم کا اندازہ شہروں کے ٹریفک اور ہوٹلوں کے غسل خانوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ پیرس کی سڑکوں کا احوال تو ہم بیان ہی کر چکے ہیں اب غسل خانوں کا تذکرہ بھی سُن لیجئے۔ پیرس میں (اور تمام یورپ کے شہروں میں) جگہ جگہ غسل خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ غسل خانے انتہائی صاف سُتھرے اور آراستہ ہوتے ہیں۔ ایک تو مسلسل صفائی کا انتظام ہے، دوسرے استعمال کرنے والے بھی سلیقے اور تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہمارے آپ کے گھروں کے غسل خانے بھی ایسے نہیں ہیں جیسے وہاں کے پبلک ٹوائلٹس ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک ریسٹورنٹ کے غسل خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کُشادہ سیڑھیوں سے گزر کر غسل خانے میں پہنچے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سوچا شاید ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ اس قدر صاف سُتھرا اور چمکدار تھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر خوشبو سے مہکتا ہوا۔ باہر نکل کر دوبارہ دروازے پر لکھی ہوئی تحریر اور تصویر دیکھی تو تصدیق ہو گئی کہ واقعی غسل خانہ ہی ہے۔ بڑی احتیاط اور احترام سے ہم اندر داخل ہوئے۔ کچھ حصّے میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔ اس کے آگے سفید ٹائلز کا فرش تھا جو باقاعدہ لشکارے مار رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے کہ کہیں

پھسل ہی نہ جائیں۔ سچ جانیے اس غسل خانے کو بطور غسل خانہ استعمال کرنے کو ہمارا بالکل جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔ مختلف رنگوں اور سائزوں کے تولیے ہاتھ خشک کرنے کو بجلی کی گرم ہوا، سونگھنے کو خوشبو، سبھی آسائشیں موجود تھیں۔ بیرونی کمرے میں دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت میز پر ایک نقرئی برتن رکھا ہوا ہے جس میں مختلف سکے پڑے ہوتے ہیں۔ غسل خانہ استعمال کرنے والے اپنی خوشی سے جو چاہیں اس برتن میں ڈال دیتے ہیں۔ نہ ڈالیں تو بھی کوئی شکوہ نہیں۔ جہاں تک غسل خانوں کا تعلق ہے یورپ کے ہوٹلوں میں ہم نے بڑے شاہانہ قسم کے غسل خانے دیکھے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کے غسل خانوں میں بھی سفید براق قالین۔ خوشبودار صابن، شیمپو اور سینٹ کی شیشیاں دیکھیں تو حیران رہ گئے۔ اور لطف یہ کہ ان اضافی چیزوں کی سہولتوں کا معاوضہ بھی وصول نہیں کرتے۔ مگر یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں جب مہنگائی کے عفریت نے اتنی جسامت اختیار نہیں کی تھی۔ اب تو یہ باتیں قصۂ پارینہ معلوم ہوتی ہیں۔

پیرس دنیا بھر میں آرٹ اور کلچر کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے یہ حیثیت زمانہ قدیم سے حاصل ہے۔ یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کا کوئی فن کار اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ مشقت اور ریاضت کے کچھ دن پیرس میں نہ کاٹے۔ پیرس کے میوزیم نوع بہ نوع نوادر اور شاہکاروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ہم بھی میوزیم دیکھنے گئے۔ ایک مشکل تو یہ ہے کہ کوئی ایک میوزیم ہو تو کوئی دیکھ لے۔ وہاں تو درجنوں میوزیم اور عجائب گھر ہیں اور ہر ایک اتنا لمبا چوڑا کہ اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں ہی دنوں، ہفتوں لگ جاتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب آپ ہر چیز کو محض ایک سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے گزر جائیں۔ اگر بغور دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا ارادہ ہے تو پھر اس کے لیے مہینوں، سالوں درکار ہیں۔ ہر شاہکار ایسا کہ انسان

وہیں رک کر دیکھتا رہ جاتا ہے۔ نظم ونسق اور زیبائش بھی قابلِ دید ہے۔ میوزیم نہ صرف اندر سے دیکھنے کے قابل ہیں بلکہ باہر سے بھی انتہائی دیدہ زیب اور دلکش ہیں۔ میوزیم تو ایک طرف آپ کو پیرس کی مختلف سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر بھی فنونِ لطیفہ کی نمائشیں نظر آجاتی ہیں۔ ملک ملک سے فن کار یہاں آکر اپنے قیام اور تربیت کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے جو تصاویر وغیرہ بناتے ہیں وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر فروخت کر دیتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی نادر تصاویر بھی مل جاتی ہیں۔ پھر ایسے آرٹسٹ بھی کرسیاں اور سٹول ڈالے دکانوں کے برآمدوں میں بیٹھے مل جاتے ہیں جو ہاتھ کے ہاتھ آپ کی تصویر بنا کر آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی حال موسیقاروں وغیرہ کا ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک موسیقار گھومتے پھرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں، ریسٹورانوں میں اپنی موسیقی سے آپ کو شاد کام کرتے ہیں جس کا جی چاہے کچھ دے دے۔ ورنہ کوئی شکایت نہیں۔ پھر بھی یہ لوگ خاصے معقول پیسے اکٹھے کر لیتے ہیں۔ یہی عالم روم میں بھی دیکھا۔ خصوصاً اتوار کے روز وہاں موسیقار اور سازندے موٹر سائیکلوں پر گھر سے نکلتے ہیں اور ہوٹل ہوٹل، ریسٹوران ریسٹوران گھوم کر تھوڑی تھوڑی دیر میوزک سنا کر شوقینوں سے اچھے خاصے پیسے بٹور لیتے ہیں۔ ایک بار ہم اپنی بیگم اور ایک دوست کے ساتھ روم کے ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ کرنسی کی دستیابی اُن دنوں بھی مشکل تھی۔ ہم ایک ایک لیرا بڑی احتیاط سے خرچ کرتے تھے ایک اتوار کو ایک ریسٹوران میں بیٹھے مینو کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حساب کتاب کر رہے تھے کہ کم سے کم خرچ والا لنچ کونسا ہو سکتا ہے کہ ایک نوجوان موسیقار گٹار ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔ سبھی حاضرین اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اس نے اطالوی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دو چار باتیں کیں اور پھر موسیقی شروع کر دی۔ جس کی میز کے پاس جاتا وہ کچھ نہ کچھ اس کی نذر کر دیتا۔ بعض لوگوں نے کچھ بھی نہیں دیا محض

داد پر اکتفا کیا۔ مگر جب وہ ہماری میز کے پاس آیا تو غریب الوطنی اور کرنسی کی کمی کے باوجود ہم نے بھی دو سو لیرا اس کے حوالے کر دیئے۔ پندرہ بیس منٹ میں چھ سات ہزار لیرا کما کر وہ دوسرے ریسٹوران کی جانب چل دیا۔ ہمارے دوست کہنے لگے "بھائی اگر ہم بھی یہ کام سیکھ لیتے تو غربت میں یوں پریشان اور خوار نہ ہوتے. گٹار لے کر ہوٹل سے نکلتے اور ایک ہی دن میں مہینے بھر کا خرچہ کما لیتے۔"

یہ تو موسیقاروں کی آمدنی کا نہایت مہذب اور معقول طریقہ ہے۔ مگر انڈر گراؤنڈ ٹرینوں کے سٹیشنوں پر اور مختلف بازاروں کے برآمدوں میں بھی کوئی صاحب یا ایک جوڑا گٹار بجا کر گاتا ہوا نظر آجاتا ہے، ان کے سامنے ایک ہیٹ پڑا ہوتا ہے جس کی طرف سے وہ بالکل بے پروا اور بے نیاز نظر آتے ہیں مگر گزرتے ہوتے لوگ اس میں سکّے اور بعض تو نوٹ بھی ڈال جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں کسی زمانے میں تو ہپّی ہوا کرتے تھے مگر بعد میں جب گداگری عام ہوئی تو مانگنے والوں میں ہر قسم کے لوگ نظر آنے لگے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے۔

پیرس میں ہمارا قیام خلافِ توقع نو دس دن رہا۔ اس دوران میں زیادہ تر بارش رہی۔ پھر بھی ہمیں پیرس دیکھنے کا موقع مِل گیا۔ سچ پوچھئے تو یہ شہر دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ کافی طویل عرصے رہنے کے لیے ہے۔ اس کے بغیر آپ پیرس کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ نہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قوم اپنی نفاستِ طبع اور گوناگوں خوبیوں کے باعث اگر دُنیا بھر میں مشہور ہے تو کوئی غلط نہیں ہے۔ آزادی اور حُریّت پسندی ان کے خون میں سرایت کر چکی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جن دنوں الجزائر کے لوگوں نے آزادی کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور فرانس کی حکومت اس کو بغاوت کہہ کر کچلنے کی کوششوں سے مصروف تھی اُس زمانے میں بھی فرانس کی آبادی کا ایک معقول حصّہ اس ظلم و ناانصافی کا سخت

مخالف تھا۔ فرانس کے ادیب اور صحافی اس ظلم کے خلاف کہانیاں اور اداریئے لکھ رہے تھے، شاعر نظمیں تحریر کر رہے تھے، آرٹسٹ تصاویر بنا رہے تھے اور کُھلّم کُھلّا اپنی حکومت کو مطعون کر کے اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ الجزائر میں ظلم و ستم بند کر کے وہاں کے لوگوں کو خود مختاری دے دی جائے۔ جو بالآخر ہُوا بھی۔ مگر فرانس کے لوگوں نے اِس تحریکِ آزادی میں جو خود ان کی حکومت اور قوم کے خلاف تھی، دُنیا کی دوسری اقوام سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ الجزائر کو آزادی دِلا کر ہی چھوڑی۔ آج بھی فرانس اپنی حُریّت پسندی اور آزادیٔ طبع کے لیے مشہور ہے۔ فرد کی آزادی مثالی صورت میں وہاں موجود ہے۔ جمہوریت اپنی اصل رُوح سمیت اس مُلک کے جسم و جاں میں سمائی ہوئی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد فرانس کو جرمن تسلط سے آزادی ملی تو ملک میں دوبارہ جمہوریت کا دَور دورہ شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں سیاسی جماعتوں کی کثرتِ تعداد کے اعتبار سے فرانس کی حالت وہی تھی جو آج پاکستان کی ہے۔ انتخابات میں کوئی ایک جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کر سکتی تھی تو حکومت ٹوٹ جاتی تھی اور ازسرِ نَو انتخابات منعقد ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے حکومتوں کی زندگی بہت مختصر ہُوا کرتی تھی۔ بعض حکومتیں تو تین دن بھی قائم نہ رہ سکیں۔ لیکن جمہوری روایات ہر صورت میں نبھائی گئیں۔ سیاسی، اقتصادی، سائنسی اعتبار سے فرانس آج بھی رقبے کے اختصار کے باوجود سرکردہ اقوامِ عالم کی فہرست میں شامل ہے اگرچہ بارہا وہاں سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوتے مگر قوم نے ان پر قابو پا لیا۔

اگر جنرل ڈیگال کو جدید فرانس کا نجات دہندہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ شخص اپنی ثابت قدمی، اصول پرستی اور خود اعتمادی کی بنا پر دُنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ جرمنوں نے فرانس پر قبضہ کیا تو بھی آزادی کی تحریک چلاتے رہے۔ ملک

کی آزادی کے بعد جب دیکھا کہ کوئی ان کی بات پہ کان نہیں دھرتا تو پیرس کو خیر باد
کہہ دیا اور اپنے گاؤں کے مکان میں جاکر بیٹھ گئے۔ جہاں ٹیلی فون تک نہ تھا۔ بیوی
سے کہا کہ جب قوم کو میری ضرورت ہوگی تو خود ہی مجھے تلاش کرلے گی۔ اس طرح
گوشہ نشینی اور گمنامی کی زندگی کا آغاز کیا۔ مگر کچھ سال بعد وہی ہوا جس کی ڈیگال
نے پیش گوئی کی تھی۔ قوم کو آخر کار ڈیگال کی ضرورت محسوس ہوئی تو لوگ جنرل ڈیگال
کو تلاش کرتے ہوئے ان کے گاؤں کی رہائش گاہ میں پہنچے۔ جنرل ڈیگال نے اس
شرط پر واپس آنا قبول کیا کہ وہ کسی غلط اور غیر اصولی بات پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔
فرانس کی سربراہی سنبھال کر ڈیگال نے بعض انتہائی پُرخطر فیصلے کیے، کوئی اور فرانسیسی
لیڈر ایسے اقدامات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جنرل ڈیگال نے مصلحتوں
اور دُنیا کی نکتہ چینی کو بالائے طاق رکھ دیا اور فرانس کو ایک نئی زندگی بخش دی۔
الجزائر کو آزادی دینے کا فیصلہ بھی جنرل ڈیگال ہی نے کیا تھا۔ جنرل ڈیگال کی
کئی خصوصیات قائداعظم کے مانند تھیں۔ وہی اصول پر ڈٹ جانا مصلحت کے آگے
سر نہ جھکانا۔ بصیرت اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی فیصلے کی قوت۔ دراصل یہ لوگ
لیڈر تھے۔ قوم کی راہنمائی کرتے تھے۔ وہ قدم اُٹھاتے تھے جن کی ان کے خیال میں
قوم اور ملک کو ضرورت تھی۔ قوم کے مزاج اور موُڈ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے۔
دیکھا جائے تو قیادت کی یہی شان ہونی چاہیے۔ ہمارے مرحوم صدر ایوب خاں کو بھی
ان کے مدّاحوں نے ایشیا کا ڈیگال کہنا شروع کردیا تھا اور خود صدر ایوب مرحوم کو
بھی کسی حد تک یقین آگیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جنرل ایوب اور جنرل ڈیگال میں
کوئی ایک بات بھی مشترک نہ تھی سوائے اس کے کہ دونوں حضرات فوجی تھے۔ بنیادی
چیز تو یہ تھی کہ ڈیگال کے خیالات اور فیصلے اپنے ہوا کرتے تھے جبکہ صدر ایوب
دوسروں کے مشورے پر عمل کیا کرتے تھے۔ خیر، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

تذکرہ ہو رہا تھا ڈیگال کے زمانے اور ان کے بعد کے فرانس کا۔ ڈیگال نے
فرانس کو وہ خود اعتمادی اور جرأت بخش دی تھی کہ یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں
امریکی فیصلوں کو للکارنے والا اور امریکی حکومت سے اختلاف رکھنے والا یہ پہلا ملک
تھا۔ امریکہ نے بہت ڈرایا دھمکایا، مختلف قسم کے ڈراوے دیئے، لالچ بھی دیئے
مگر فرانس کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ فرانس ہی یورپ کا پہلا ملک تھا جس
نے امریکہ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور معاملات طے کیے۔ فرانس کا
کہنا تھا کہ امریکہ کو فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی خودمختاری اور رائے کا
احترام کرنا چاہیے نہ کہ ان پر اپنی رائے اور مرضی ٹھونسی جائے۔ فرانس غالباً یورپ
کا پہلا ملک تھا جس نے سب سے پہلے امریکہ کے ساتھ واقعی برابری کے تعلقات استوار
کیے اور بہت سے نازک اور اہم مسائل میں امریکہ کی ایک نہ سُنی۔ آج لوگ امریکہ
کو جمہوریت کا گہوارہ کہتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ امریکہ میں شخصی اور انفرادی
آزادی بہت زیادہ ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ مگر خدا
جانے فرانس کی فضا اور آب و ہوا میں کیا بات ہے کہ انسان خود بخود تازگی، شگفتگی
اور آزادی کا احساس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی بہت اہم
اور خاص قسم کا شخص بن گیا ہے۔ دل خود بخود سرخوشی اور سکون کے جذبات سے سرشار
رہتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہُوا۔ حالانکہ یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ وہ ملک ہے جہاں
کے لوگ میری زبان نہیں سمجھتے اور جن کی زبان مَیں نہیں سمجھتا، مگر پیرس الفاظ کا محتاج
نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ایک ذہنی، جذباتی اور تصوّراتی رابطہ پیدا کرلیتا ہے
اور پھر ایک عجیب و غریب بات مَیں نے یہ بھی محسوس کی کہ پیرس کی ہر خوبی اور
وہاں کے ہر تاریخی ورثے پر میرا بھی یوں فخر کرنے کو جی چاہا جیسے وہ میرا ہی ہو۔ حالانکہ
مَیں نے دوسرے شہروں کے نوادرات اور میوزیم بھی دیکھے۔ شہروں کے حسن و رعنائی

سے لطف اندوز بھی ہوا۔ مگر ہر دم یہی احساس رہا کہ اس میں میرا کچھ بھی نہیں ہے یہ تو دوسروں کی میراث ہے۔ حد تو یہ ہے کہ لندن کے عجائب گھروں میں ہندوستانی نوادرات کو دیکھ کر بھی مجھے اپنائیت کا احساس نہ ہو سکا۔ ہے نا عجیب بات ؟!

پیرس کے عجائبات اور قابلِ دید مقامات کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ لیکن ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ دُنیا کے اکثر مشہور مقامات کے بارے میں جو سُن رکھا تھا یا تصویریں دیکھ کر اُن کے بارے میں جو اندازے قائم کیے جب بنفسِ نفیس وہاں گئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا تو نہ وہ دلکشی اور خوبصورتی نظر آئی نہ وہ شکوہ۔ لیکن پیرس کی بات مختلف ہے۔ آرچ ڈی ٹرائمف۔ شانزے لیزے، ایفل ٹاور اور خود سارا شہر پیرس تصویروں اور تصوّرات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر ایفل ٹاور فلموں اور تصویروں میں محض ایک اونچا سا مینار ہی تو نظر آتا ہے لیکن جب وہاں گئے اور ایفل ٹاور کو دیکھا تو مرعوب ہو کر رہ گئے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ سہم گئے۔ ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے آس پاس کا علاقہ اس قدر وسیع و عریض اور دلکش ہے کہ ایفل ٹاور سے قطع نظر اس کے اردگرد کا ماحول بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایفل ٹاور اس قدر مہیب اور دیو قامت چیز ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ سالہا سال قبل لوہے اور فولاد کی اس قدر جامع، پیچیدہ اور عظیم الشان دیو ہیکل چیز بنا دینا واقعی انسانی ہُنرمندی اور ذہن کا کمال ہے اور پھر حُسن و نفاست کے اعتبار سے بھی یہ خاصے کی چیز ہے۔ ایفل ٹاور کے اوپر سے پیرس کا نظارہ طلسمات سے کم نہیں ہے۔ اِن چھوٹی چھوٹی اقوام نے کسی زمانے میں ساری دُنیا کو زیر و زبر اور محکوم بنا رکھا تھا۔ آخر ان میں کوئی تو خوبی اور عظمت تھی اور اب بھی جبکہ فرانس کی نوآبادیاں، جو سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوتی تھیں، باقی نہیں رہی ہیں اور فرانس سمٹ اور سُکڑ کر اپنی جغرافیائی حدود میں محدود ہو کر رہ گیا ہے، یہ قوم

ساری دُنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے۔ کہاوت ہے کہ ہاتھی لُٹنے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ فرانس بھی اپنی نوآبادیوں سے محروم ہونے کے باوجود اپنے حُسن، اثر و رسوخ اور اپنی عظمت سے محروم نہیں ہوا ہے۔

پیرس کے ریسٹورانوں اور ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ کھانوں کے بارے میں بھی کچھ بتاتے چلیں۔ فرانس کے کھانے دُنیا بھر میں مشہور ہیں مگر افسوس کہ ہم پاکستانیوں کے ذوق پر پورے نہیں اُترتے۔ یہ پھیکے، بدمزہ کھانے بھلا ہمیں کیا پسند آتے۔ جہاں تک سمندری خوراک کا تعلق ہے وہ ہمیں پسند ہی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ بیشتر کھانوں میں کسی نہ کسی طور "جمبون" کا استعمال بھی ہوتا ہے جو سُور کا فرانسیسی تخلّص ہے۔ ہم نے بعض کھانے بہت دیر تک مینو کا مطالعہ کرنے کے بعد چکھنے کی غلطی بھی کی مگر شومئی قسمت سے ایک بھی ہمارے حلق سے نہ اُتر سکا۔ لیکن یورپین کھانوں کے شائقین کے لیے فرانس کے کھانے نعمت سے کم نہیں ہیں۔ اتنے انواع و اقسام کے ہوتے ہیں کہ نام یاد رکھنا بھی دشوار ہے۔ ان کو بڑی نفاست، نزاکت اور خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے اور اِس قدر لطیف اور حسین شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ جی نہیں چاہتا کہ کھائیں بلکہ دل چاہتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیں۔ جس طرح مغل اور نوابان اودھ نئی نئی اقسام کے کھانے ایجاد کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے، اِدھر یورپ میں فرانس والے بھی اسی شغل میں لگے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں بھی کھانوں کی اقسام کی فہرست شیطان کی آنت کی مانند طویل ہے۔ یوں بھی فرانس والوں کی جدّتِ طبع نے ہر میدان میں نئے نئے گُل کھلائے ہیں۔ کھانے، ملبوسات، شرابیں، خوشبوئیں ہر چیز میں ایجادیں کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی انکی سیری نہیں ہوتی۔ خوشبو ہی کو دیکھیے تو بے شمار اقسام کی خوشبوئیں بنا رکھی ہیں۔ اور تو اور پنیر کم سے کم پچپن ساٹھ مختلف ذائقوں۔ شکلوں اور اقسام کا ہوتا ہے۔ ہم نے ایک ریسٹوراں میں پنیر کی فرمائش کی تو نازک اندام ویٹریس ایک ٹرالی لے کر

آ گئیں جس میں عجیب عجیب شکلوں کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ کسی پر بسکٹ کا، کسی
پر کیک کا۔ کسی پر کباب کا گمان گزرتا تھا۔ معلوم ہوا یہ سب پنیر کی مختلف اقسام ہیں
ہم تو جیسے فرمائش کرکے پھنس گئے۔ کیا کھائیں، کیا نہ کھائیں؟ ایک پنیر ایسا دیکھا جس
میں کیڑے کُلبُلا رہے تھے۔ ہمیں تو بہت گھن آئی مگر ہمارے دوست نے بتایا کہ
یہ بے حد قیمتی اور لذیذ پنیر سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو آنکھوں دیکھی
مکھی نہیں نگل سکتے بھلا آنکھوں دیکھے کیڑے مکوڑے کیسے ہضم کر لیتے؟ آخر ہم نے
بہت غور و خوض کے بعد وہی پنیر پسند کیا جو لاہور میں بھی دستیاب ہے اور جو
ہم بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

پیرس میں تو دس دن کا قیام بے حد پُر لطف اور رنگین رہا۔ ہاں۔ یہ تو بتانا ہی
بھول گئے کہ ہم نے پیرس کی ہیرا منڈی بھی دیکھی۔ کچھ عرصے قبل ایک امریکی فلم میں
پیرس کا بازارِ حُسن دکھایا گیا تھا۔ وہاں گئے تو سب نے کہا کہ بھلا یہ کیا تُک ہے کہ پیرس
میں آئیں اور بازارِ حُسن نہ دیکھیں۔ وطن واپس پہنچ کر لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟
چنانچہ ٹیکسی میں سوار ہو کر "پیگال" کی راہ لی۔ ٹیکسی ڈرائیور اِس قدر باتونی تھا کہ ہم
رُوم کے ٹیکسی ڈرائیور کو بھول گئے۔ اللہ کے بندے نے قسم کھانے کو بھی سانس تک
نہ لی اور لگاتار بولتا ہی رہا اور وہ بھی سو فیصد فرانسیسی زبان میں۔ ہماری میں تو
خاک بھی نہیں آیا۔ تنگ آکر اداکار نہری صاحب نے اس کی تقریر بند کرنے کے لیے
اس سے پنجابی بولنی شروع کر دی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا اور ایک
دم خاموش ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھوں کو حرکت دے دے کر دوبارہ
اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا جو اسے بِل کی ادائیگی کرنے تک جاری رہا۔ یقین کیجئے اگر
ہم پیرس کی سڑکوں سے ناواقف نہ ہوتے تو اس شخص سے محفوظ رہنے کی خاطر راستے
میں ہی اُتر جاتے۔ "پیگال" پہنچے تو آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں اور بہت حیران بھی

ہوتے۔ ہم تو بہت شرماشرمی میں وہاں گئے تھے۔ سوچا تھا کہ نگاہیں جھکا کر رہیں
گے مگر دیکھا کہ وہ تو ایک نہایت کُشادہ اور بارونق علاقہ ہے اور انتہائی صاف سُتھرا۔
درمیان میں باغ ہے اور دونوں اطراف میں چوڑی سڑکیں ہیں۔ بہت وسیع فٹ پاتھ
ہیں جہاں رات اور دن میں ہر وقت میں سیّاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کیفے اور
ریسٹوراں بھی بہت ہیں جہاں بیٹھ کر سیّاح اپنے عزیزوں، دوستوں اور گھر
والوں کو تصویروں والے پوسٹ کارڈ لکھتے ہیں۔ ہر قسم کی دوکانیں اس علاقے میں
موجود ہیں۔ البتّہ نائٹ کلبوں کا یہ گڑھ ہے اور سیکس شاپس بھی زیادہ اسی علاقے
میں پائی جاتی ہیں۔ مگر ماحول انتہائی صاف سُتھرا اور پاکیزہ ہے اور کسی قِسم کی گندگی
کا احساس مطلق نہیں ہوتا۔ ہر ملک اور قوم کے مرد اور عورتیں ہیں کہ غول در غول
گلگشت میں مصروف ہیں۔ ریسٹوران میں کھا پی رہے ہیں۔ دوکانوں سے شاپنگ
کر رہے ہیں۔ غالباً اس علاقے کی عالمی شہرت کے پیشِ نظر وہ یادگار کے طور پر
"پیگال" سے چیزیں خریدنا پسند کرتے ہیں۔ ہم حیران تھے کہ پھر وہ "بازارِ حُسن" کہاں
ہے؟ ہم نے لاہور کی ہیرا منڈی، دہلی کا چاوڑی بازار، کراچی کی نیپئر روڈ بھی
دیکھی ہے اور اسی قسم کا ماحول تصوّر ذہن میں لے کر گئے تھے مگر سوائے نائٹ کلبوں
اور سیکس شاپس کی موجودگی کے اس بازار میں بظاہر کوئی عامیانہ پن یا بیہودگی
نظر نہیں آتی اور لوگ بھی انتہائی شائستہ اور مہذب۔ پُوچھا آخر وہ گلیاں کہاں
ہیں جو فلم "اِرما لاڈوس" میں دیکھی تھیں؟ ایک صاحب نے اشارے سے سامنے
کی طرف اشارہ کیا جہاں کُشادہ سڑک کے ساتھ ساتھ صاف سُتھری گلیاں بھی تھیں۔
جب اس فٹ پاتھ پر سے گزرے اور گلیوں میں نظر ڈالی تو یہاں وہاں کچھ حسینائیں
دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑی نظر آگئیں اور ہمیں دیکھ کر بہت اپنائیت اور
خلوص سے مُسکرائیں بھی۔ یہ تو دن کا وقت تھا سُنا ہے رات کو ان گلیوں میں اور

زیادہ روشنی ہوتی ہے۔ قمقموں کی بھی اور ماہتابی چہروں کی بھی۔ بہرحال ہمیں تو
پیرس کا بازارِ حُسن دیکھ کر خاصی مایوسی ہوتی۔ وہ ہماری والی بات ہی نہیں ہے۔

آخر میں نائٹ کلبوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ ہم سے ایک صاحب
نے کہا تھا کہ اگر پیرس سے نائٹ کلب دیکھے بغیر ہی چلے گئے تو لوگوں کو کیا منہ دکھاؤ
گے؟ پیرس میں ہر قسم کے نائٹ کلب موجود ہیں۔ سستے کلبوں میں ظاہر ہے کہ
عامیانہ اور سستی حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں مگر مشہور زمانہ نائٹ کلبوں کی بات ہی
الگ ہے۔ مثال کے طور پر "لیڈو" اور "مولین رُوژ" وہاں کے دو نہایت مشہور
اور بڑے نائٹ کلب ہیں۔ ان کے ٹکٹ بھی بہت مہنگے ہوتے ہیں مگر اس میں کلام
نہیں کہ ان کے شو دیکھنے والے کی سٹی گم کر دیتے ہیں اور عقل حیران رہ جاتی ہے
کہ ایک محدود سی عمارت کے سٹیج پر یہ سب تماشے کیوں کر دکھاتے جا سکتے ہیں۔
مثلاً ہم نے دیکھا کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوتی ہے۔ لوگ اپنی میزوں پر خاموش منتظر
ہیں۔ اچانک دُور ایک سُرخ روشنی کا نُقطہ سا نظر آیا جو بڑھتے بڑھتے نزدیک آیا
تو ہیلی کاپٹر نکلا۔ اب ایک زیرِ زمین عمارت میں جو بظاہر عام عمارتوں کی مانند
ہے ہیلی کاپٹر اُڑنے کا تصوّر ہی ناقابلِ یقین ہے۔ مگر یہ سچ مچ ہو رہا تھا اور ہماری
آنکھوں کے سامنے۔ ہیلی کاپٹر میں سے درجنوں بلکہ سینکڑوں لڑکیاں کود کود کر باہر
نکلیں اور انھوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ نہ جانے ہیلی کاپٹر کس وقت اور
کہاں چلا گیا۔ پھر جو شو کا آغاز ہوا تو آخر تک ایک آئیٹم کے اندر سے دوسرا آئیٹم
خود بخود یوں نمودار ہوتا کہ دیکھنے والا ہکا بکا رہ جاتا۔ سینکڑوں لڑکیاں ناچ رہی
ہیں۔ کبھی بازی گر تماشہ دکھا رہے ہیں یہاں تک کہ ریگستان میں گھوڑے دوڑتے
ہوتے بھی نظر آگئے۔ پھر نخلستان کا منظر سامنے آیا۔ دراصل اس شو کے بارے میں بتانا
ممکن نہیں ہے کہ اس سے انصاف نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

ناچنے والی لڑکیوں کے لباس کو آپ قابلِ اعتراض اور عُریاں کہہ سکتے ہیں مگر مغرب
میں تو عُریانی ویسے بھی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اور کوئی قابلِ ذکر یا قابلِ اعتراض
چیز نہیں رہ جاتی۔ بعد میں دُنیا بھر میں ہر شہر میں بڑے بڑے نائٹ کلب بن گئے
مگر پیرس والوں کو اِس میدان میں بھی راہنمائی کا شرف حاصل ہے۔

دس دن کے بعد ہم بذریعہ ٹرین پیرس سے ہالینڈ کے شہر ہیگ روانہ ہوگئے۔

ذرا ہالینڈ تک

یورپ میں ریل کا سفر ایک انتہائی دل خوشکُن تجربہ ہے۔ خوبصورت، صاف ستھرے آرام دہ کمپارٹمنٹ، مہذّب اور خوش گفتار اور خوش لباس ہم سفر۔ جن راستوں سے ریل گزرتی ہے ان کا حُسن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات، دیہات اور نہایت مختصر گاؤں تیزی سے پیچھے کی جانب دوڑتے ہوئے حدِ نگاہ تک سرسبز و شاداب پہاڑیاں، میدان اور چراگاہیں۔ غرضیکہ ایک عجیب دلکش منظر ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ یہ سفر ختم نہ ہو۔ نہ کمپارٹمنٹ میں اور نہ ہی پلیٹ فارم پر شور و غل اور ہڑبونگ نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہر ریل گاڑی میں ایک ڈائننگ کار بھی ہوتی ہے جہاں سے آپ اپنی ضرورت کی کھانے پینے کی اشیاء (عموماً سنیکس، جوس، چائے، کافی وغیرہ) خرید سکتے ہیں۔ اور پھر اگر آپ ایک مُلک سے دوسرے مُلک کے لیے سفر کر رہے ہوں تو اور بھی پُر لُطف تجربہ ہوتا ہے۔ ٹرینوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ مقررہ وقت پر اپنے مُستقر سے چلتی ہیں اور ہر سٹیشن پر عین اسی وقت پہنچتی ہیں جو ان کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ گھنٹوں کی تو بات ہی کیا ہے منٹوں اور سیکنڈوں کے حساب سے بھی ٹرین لیٹ نہیں ہوتی۔ مجھے پہلی بار بہت عجیب سا لگا جب مَیں نے سوئٹزرلینڈ میں لوزان سے جنیوا جاتے ہوئے ایک

صاحب سے پُوچھا کہ یہ ٹرین کتنی دیر میں جنیوا پہنچے گی۔ میں دراصل مسافت اور وقت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے جواب میں کہا "ایک بج کر چالیس منٹ پر" لیجئے۔ جھگڑا ہی ختم ہو گیا اور اس وقت تو قائل ہی ہو گئے جب ٹرین واقعی اسی وقت جنیوا کے پلیٹ فارم میں پہنچ کر رُک گئی۔ ٹرینوں میں عموماً بہت زیادہ ہجوم نہیں ہوتا نہ ہی پلیٹ فارم پر مسافروں کا جمِ غفیر ہوتا ہے۔ دھکم دھکّا اور بدنظمی کا تو یورپ میں ویسے بھی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ وقت مقرّرہ پر ٹرین پہنچی۔ اُترنے والے مسافر پہلے ہی مختصر سا سامان سنبھالنے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ ٹرین سے اُترنے میں چند سکینڈ ہی لگاتے ہیں۔ اسی طرح سوار ہونے والے مسافر چند سکینڈ میں سوار ہو جاتے ہیں۔ نہ قُلیوں کا شور، نہ ہاکروں کی آوازیں، نہ ایک دوسرے کو دھکیل کر سوار ہونے کی کوشش، نہ کھڑکیوں کے راستے بچّوں اور سامان کو ڈبے میں داخل کرنے کا مظاہرہ، لیجئے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں مسافر اُتر بھی گئے اور سوار بھی ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر پلیٹ فارم پر ٹرین کے رُکنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ایک دو منٹ ہی ہوتا ہے۔

مگر اس سے پہلے پیرس سے رُخصت ہونے کا کچھ بیان ہو جائے ہمارے ہوٹل پیرس میں ریلوے سٹیشن "گارڈ دُ نارد" کے سامنے واقع تھے یعنی شمالی ریلوے سٹیشن۔ پیرس میں چار ریلوے سٹیشن اپنی سمت کے اعتبار سے منسوب ہیں اور ظاہر ہے کہ بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سبھی مسافر یہاں سے سفر کرتے ہیں اندرونِ ملک اور غیر ممالک ہر جگہ کے لیے یہیں سے ٹرین ٹرینیں چلتی ہیں اس لیے خاصی رونق اور گہما گہمی رہتی ہے۔ یہ ریلوے سٹیشن بھی ایک خوبصورت اور کشادہ عمارت ہے جہاں کرنسی تبدیل کرانے سے لے کر آرائشی اشیاء اور نوادرات تک سبھی چیزوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ بکنگ آفس بہت وسیع اور ائر کنڈیشنڈ ہوتے

ہیں اور عام طور پر وہاں لوگوں کا رش ہوتا ہے مگر کیا مجال جو کوئی اونچی آواز سے بولے یا شور کرے۔ آپ داخل ہو کر ایک کھڑکی پر جائیں تو وہاں سے آپ کو نمبر مل جاتا ہے۔ پھر آپ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ کر سامنے لگے ہوئے برقی بورڈ کو دیکھتے رہیں جہاں یکے بعد دیگرے نمبر نمودار ہوتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی کھڑکی کا نمبر بھی ہوتا ہے۔ نمبر آنے پر آپ اپنی کھڑکی پر جا کر ٹکٹ خرید لیجئے یا سیٹ بُک کرا لیجئے۔ ہمارے ہاں تو جب ہوائی سفر بہت عام نہیں ہوا تھا اور کم ہی لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے تھے اس وقت بھی ائرلائنز بکنگ آفسوں میں قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ یورپ میں پلیٹ فارموں پر اشیاء فروخت کرنے والے اور ریڑھی والے بھی نہیں ہوتے۔ نہ ہی دکانیں ہوتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ سگریٹ، چپس، چاکلیٹ یا مشروبات کی فروخت کے لیے مشینیں لگی ہوتی ہیں آپ سکّے ڈالیے اور اپنی مطلوبہ چیز نکال لیجئے۔ فرش پر کوڑا پھینکنے کا رواج بھی نہیں ہے اس لیے سٹیشن انتہائی صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔

ہم لوگوں کو ٹرین کے ذریعے ہالینڈ جانا تھا۔ سترہ اٹھارہ افراد تھے اور پھر ذاتی سامان کے علاوہ فلمی ضروریات کے لیے بھی سامان کا ڈھیر ساتھ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹرین ——— تو ایک ڈیڑھ منٹ کے لیے ہی پلیٹ فارم پر ٹھہرتی تھی۔ اب اتنا ڈھیر سامان اتنی عجلت میں کیونکر ٹرین میں لادا جاتا اور پھر ہیگ کے پلیٹ فارم پر اتنے جھٹ پٹ کیسے اُتارا جاتا؟ قلیوں کا وہاں رواج نہیں ہے ہاں زیادہ سامان ہو تو ٹرالی والا پورٹر دستیاب ہو جاتا ہے۔ ہم نے تین چار پورٹرز کی خدمات خاص طور پر حاصل کیں۔ انھیں جب سامان دکھایا تو وہ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ انھوں نے مسافروں کے ساتھ اس قدر زیادہ سامان کاہے کو دیکھا ہوگا۔ بہرحال انھیں سمجھایا گیا کہ یہ فلمی یونٹ کی ضرورت کا سامان ہے اور

مقرّرہ وقت کے اندر ٹرین میں لادنا ہے۔ انھوں نے وعدہ تو نہیں کیا البتّہ یہ کہا کہ کوشش کریں گے۔ چنانچہ طے پایا کہ ٹرین کی آمد سے پہلے ہی وہ ٹرالی میں سامان لے کر تیار رہیں گے اور جیسے ہی ٹرین رُکی ہم سب مل کر یہ سامان ٹرین میں لاد دیں گے۔ جب ٹرین آئی تو ہم سب نے سامان اُٹھا کر اندھا دھند ٹرین میں رکھنا شروع کر دیا حالانکہ پہلے ہمیں اُترنے والے مسافروں کو موقعہ دینا چاہیے تھا۔ وہ بے چارے اس آفتِ ناگہانی سے گھبرا گئے۔ بہرحال ہم سب نے بمشکل تمام سامان ٹرین میں لادا۔ اگر پورٹرز پر بھروسہ کرتے تو تقریباً آدھا سامان وہیں رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اُترنے والے مسافروں نے اور ٹرین میں بیٹھے ہُوئے مسافروں نے، ہمیں بہت گھُور گھُور کر دیکھا۔ مُنہ سے کچھ کہنے کا وہاں رواج بالکل نہیں ہے۔ مگر یہاں گھُورنے کی پروا کسے ہوتی ہے۔ اور پھر یہ تو ہنگامی حالات تھے۔

ٹرین مقرّرہ وقت پر چل پڑی اور ہم میں سے چند حضرات بمشکل بھاگتے ہوئے چلتی ٹرین میں سوار ہوئے۔ یہ بھی وہاں والوں کے لیے ایک عجیب و غریب نظّارہ تھا کیونکہ چلتی ریل گاڑی میں سوار ہونے یا اس میں سے اُترنے کا وہاں کوئی رواج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی پولیس والے کی نظر پڑ جاتی تو وہ ہمیں اس جُرم میں دھر ہی لیتا۔ مگر خیریت گذری کہ آس پاس کوئی قانون نافذ کرنے والا افسر موجود نہیں تھا۔ ٹرین میں سوار ہونے کے کچھ عرصے بعد ہوش و حواس بجا ہوئے اور ہم لوگوں نے سامان کو ٹھکانے پر رکھنے کے مسئلے سے فُرصت پائی تو ریل گاڑی کے تمام ڈبّوں کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک جائزہ لیا گیا۔ یہ تمام ڈبّے آپس میں منسلک ہوتے ہیں۔ آخری کنارے پر ڈائننگ کار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے کنارے پر انجن۔ آرام دہ سیٹوں پر بیٹھ کر ہم نے کھڑکی سے باہر فرانس کے کنٹری سائیڈ کا نظارہ شروع کیا جو حقیقت میں ایک انتہائی خوبصورت تجربہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے کھیتوں اور

چراگاہوں کے علاوہ ساری زمین کو نشیب و فراز کی صورت دینے کے بعد ہر طرف سبزہ
اُگانے کا اہتمام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا کوئی خشک، بنجر اور بدنما ٹکڑا دیکھنے
کو بھی نہیں ملتا۔ کسانوں کے گھر مختصر لیکن انڈے کی طرح سفید، چمکتے ہوتے اور ارد گرد
کا ماحول بھی صاف ستھرا اور دلکش۔ گھروں کے سامنے کاریں، ٹریکٹر اور جیپ گاڑیاں
بھی کھڑی نظر آئیں۔ یورپ اور امریکہ کے دیہات شہروں سے زیادہ پُرسکون خوبصورت
اور پُرکشش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ توفیق دیتا ہے وہ نواحِ دیہات
میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ صاحبِ ثروت لوگ شہر کے ساتھ دیہات میں بھی اپنی رہائش
کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان دیہات میں جدید زندگی کی تمام سہولتیں مہیا ہوتی ہیں اور پھر
سب سے بڑھ کر سکون اور خاموشی جس کا شہروں میں فقدان ہے۔

ڈین ہیگ

فرانس کی سرحدیں ختم ہوئیں اور بلجیم کا علاقہ شروع ہو گیا۔ بظاہر دیکھنے میں ہمیں
دونوں ملکوں کے دیہات میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آیا۔ بلجیم کا ویزا ہمارے پاس
نہیں تھا کیونکہ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ہمیں بلجیم سے
بھی گزرنا ہوگا۔ طریقہ یہ ہے کہ جوں ہی ایک ملک کی سرحد ختم ہو کر دوسرے ملک کی
حد شروع ہوتی ہے۔ امیگریشن سے تعلق رکھنے والے ایک باوردی افسر آتے ہیں آکر
پاسپورٹ اور ویزا چیک کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کنڈکٹر نما صاحب آ کر
دریافت کرتے ہیں کہ مقامی کرنسی کی ضرورت تو نہیں ہے اور طلب کرنے پر مقامی
کرنسی تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہمیں انھوں نے اس لیے رعایت دے دی کہ ہم تو محض
علاقے سے گزر رہے تھے۔ قیام کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ گزرے وقتوں
کی بات ہے۔ رفتہ رفتہ امیگریشن کے قوانین میں بھی سختی پیدا ہو گئی اور اب تو مختلف

ملکوں کی سرزمین سے گزرنے کے لیے بھی ویزا درکار ہوتا ہے۔ بہر حال یورپ
میں ریل کا یہ سفر انتہائی دلچسپ اور خیال انگیز تھا۔

اگلی منزل ہیگ تھا جسے مقامی لوگ ڈین ہیگ کہتے ہیں۔ سب سامان سنبھال
کر پہلے ہی سے تیار ہو گئے اور جوں ہی پلیٹ فارم پر گاڑی رُکی سب نے
فوجی قسم کی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوتے ایک منٹ کے اندر ہی تمام سامان باہر
نکال دیا۔ جب ٹرین نے سیٹی دی اور حرکت میں آئی تو صرف قدیر ملک صاحب
اپنا سفری بیگ تھامے ہوتے ٹرین سے چھلانگ لگاتے ہوتے نظر آئے۔ شکر ہے
کہ ان پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی۔ پورٹرز کے ذریعے سامان سمیٹ کر ہم لوگ پلیٹ
فارم سے باہر نکلے تو دیکھا کہ انتہائی وسیع و عریض اور شفاف عمارت ہے۔ اب
سوال اقامت تھا۔ یہ شہر بھی ہم سب کے لیے اجنبی تھا مگر شکر ہے کہ ہالینڈ میں
انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد یورپ کے دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔
خواندگی کا اوسط تو ظاہر ہے کہ سو فیصد ہے مگر انگریزی جاننے اور پڑھنے والوں کی
بھی کمی نہیں ہے جو یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ایک نعمت سے کم نہیں
ہے۔ ہم نے ریلوے حکام سے ہوٹل وغیرہ کے بارے میں معلومات کرنی چاہیں تو
انھوں نے سامنے ہی واقع ایک دفتر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ V.V.V (وی۔وی۔وی)
کا ادارہ ہے۔ اندر گئے تو ایک اسمارٹ اور خوش مزاج لڑکی کاؤنٹر پر دو تین
ٹیلی فون لیے بیٹھی تھی۔ سامنے سیاحوں کا ہجوم تھا اور وہ ہر کسی سے اس کی زبان میں
بات کر رہی تھی۔ کسی سے ڈچ زبان میں، کسی سے جرمن میں، کسی سے فرانسیسی میں
تو کسی سے انگریزی میں۔ مختصر یہ کہ ہفت زبان لڑکی تھی اور خوش مزاج اور متحمل
مزاج اتنی کہ سیاحوں کی یورش اور سوالوں اور مسائل کی بوچھاڑ کے باوجود اس کے
چہرے پر پریشانی یا جھنجلاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ کسی کے لیے ہوٹل کا بندوبست کرتی،

کسی کو متعلقہ مقام کا پتہ دیتی ۔ کسی کے حوالے ڈین ہیگ یا ہالینڈ کا نقشہ کر دیتی ۔
لڑکی کیا تھی انسانی مشین تھی ۔ ہم نے بھی اپنا مسئلہ بیان کیا اور اس نے بتایا کہ ہوٹلوں
میں جگہ دستیاب نہیں ہے ۔ پھر بھی کوشش کرتی ہوں کیونکہ مسافر تو آتے جاتے ہی
رہتے ہیں ۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش اور مشقت کے بعد اس نے دو مختلف ہوٹلوں
میں ہم لوگوں کے قیام کا بندوبست کر دیا ۔ ہوٹل والوں سے بات چیت بھی طے کرا
دی اور ہمیں ایک پرچی پر ہوٹلوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیئے ۔ اس
طرح ہم اس کی کارکردگی اور فرض شناسی پر عش عش کرتے ہوئے اس دفتر سے
نکلے ۔ صاحب ۔ ہم نے اور بھی بہت سے ملک اور شہر دیکھے مگر یہ طریقہ اور کہیں
نظر نہیں آیا ۔ وی ۔ وی ۔ وی ایک سرکاری ادارہ ہے جس کے دفاتر ہالینڈ کے ہر
شہر، قصبے اور دیہات میں موجود ہیں اور اس کا مقصد سیاحوں کو معلومات، رہنمائی
فراہم کرنا ہے ۔ اس خدمت کے عوض یہ سیاحوں سے کچھ وصول نہیں کرتے ۔ خلاصہ
یہ کہ اگر آپ کسی طرح ہالینڈ کی سرحد میں پہنچ کر وی ۔ وی ۔ وی کے دفتر میں پہنچ
گئے تو سمجھئے سارے دلدّر دُور ہو گئے ۔ اب آپ کا ہر مسئلہ وی ۔ وی ۔ وی کا دردِ سر
ہے ۔ حضرت خضر کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں وہ وی ۔ وی ۔ وی پر حرف بحرف
صادق آتی ہیں ۔

ہیگ کی سڑکوں سے گزرتے ہوتے ہوٹل پہنچے ۔ یہ قدیمی شہر ہے لیکن انتہائی
خوبصورت اور صاف ستھرا ۔ پورے ملک ہالینڈ کی مانند یہاں بھی شہر میں جگہ جگہ نہریں
موجود ہیں ۔ جن میں سے بعض میں کشتی رانی بھی ہوتی ہے ۔ سڑکیں کشادہ اور صاف
شفاف ۔ نظم و نسق مثالی ۔ لیکن سڑکوں پر ٹریفک اور لوگوں کا زیادہ ہجوم نظر نہیں آیا ۔
دراصل وہاں ٹریفک اور ہجوم کے اوقات دو ہیں ۔ ایک صبح نو بجے جب لوگ دفاتر
اور کاروبار پر جاتے ہیں اور دوسرا شام کو پانچ بجے، جب گھروں کو واپس لوٹتے ہیں ۔

شور، ہنگامہ اور ہجوم مطلق نہیں ہوتا ۔ بات یہ ہے کہ ہیگ بین الاقوامی عدالتِ
انصاف کا صدر مقام اور متعدد بین الاقوامی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے باوجود
اُن دنوں محض چھ لاکھ آبادی کا شہر تھا ۔ لوگوں کا رجحان بھی شور و شر اور ہنگامہ پسندی
کی طرف نہیں ہے اس لیے بے حد پُرسکون اور پُرامن شہر ہے ۔ سرِ شام ہی دوکانیں
بند ہو جاتی ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں ۔ اس کے بعد سڑکوں
پر بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے ہیں ۔ ان لوگوں کی امن داشتی اور سکون پسندی
کا یہ عالم ہے کہ بعض جگہ رہائشی آبادیوں کے عین درمیان نائٹ کلب واقع ہیں
لیکن سوائے سائن بورڈ کے اس کے اور کوئی آثار نظر نہیں آتے ۔ نہ شور، نہ ہنگامہ
نہ موسیقی، نہ لوگوں کا ہجوم ۔ عام طور پر نائٹ کلب کے باہر تصاویر بھی نہیں ہوتیں ۔
بہت ہوا تو چند ڈانسروں کی معقول اور شریفانہ قسم کی تصویریں ایک طرف لگا دیں
اور بس ۔ نہ آس پاس والوں کو یہ احساس کہ بازو میں نائٹ کلب ہے اور نہ ہی
نائٹ کلب والوں کو یہ شکایت کہ برابر میں گھریلو ماحول ہے ۔ دونوں اپنے اپنے
کام سے کام رکھتے ہیں ۔ یوں بھی ہالینڈ کے لوگوں کو ہم نے انتہائی خلیق، حلیم اور دوستانہ
پایا ۔ ان میں کسی قسم کی خُوبُو نہیں ہے ۔ خواتین کی اکثریت پر مشرقی عورتوں کا گمان
گزرتا ہے ۔ پہناوے اور بالوں کی تراش کی حد تک تو وہ ظاہر ہے کہ یورپین ہیں
مگر مزاج میں شرمیلا پن اور جھجک ہے ۔ عام طور پر سیلز گرلز اور مختلف مقامات پر
کام کرنے والی لڑکیاں نگاہ چُرا کر بات کرتی ہیں اور مردوں سے گفتگو کرتے ہوئے
ان کے چہروں پر حجاب کی جھلک صاف نظر آتی ہے ۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی
خواتین کی طرح ان میں بے باکی اور بے حجابی نہیں ہے ۔ اور پھر یہ کہ آپ کی ہر بات
کا بڑے اخلاق سے جواب تو دیں گی مگر مردوں سے غیر ضروری گفتگو اور میل جول
سے احتراز کرتی ہیں ۔ گھریلو پن اور گرہستی میں یہ سارے یورپ میں مشہور ہیں اور

کہتے ہیں کہ بہترین بیویاں ثابت ہوتی ہیں ۔ ہم وہاں پہنچے تو کنوارے تھے ہمارے کوئی نہ کوئی ساتھی ہمیں ہر روز یہ مشورہ ضرور دیا کرتے تھے کہ بھائی ۔ اچھا موقعہ ہے ۔ یہاں سے ایک عدد بیوی تلاش کرکے لے چلو ۔ یا پھر یہیں رہ جاؤ ۔ دیکھو تو کس قدر حسین ماحول اور کتنے خوبصورت اور صحت مند لوگ ہیں (ہالینڈ دودھ دہی اور اس کی مصنوعات کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے ۔ ایک ایسے ہی سٹور کی ایک نوجوان مالکہ کو ہمارے دوست " دودھ والی " کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور وہ بھی ہنسی رہتی تھی) ہالینڈ کے مویشی بھی انتہائی صحت مند، توانا اور نایاب ہوتے ہیں اور وہاں کے ڈیری فارموں میں مویشیوں کے لیے جو اہتمام دیکھا اور سُنا تو بے اختیار رشک کرنے لگا کہ کاش ہم بھی مویشی ہوتے ۔ اور مویشیوں پر ہی کیا منحصر ہے ۔ یورپ اور امریکہ میں تو پالتو جانوروں کے اتنے مزے ہیں کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے کھاتے پیتے انسانوں کو ایسے عیش نہیں ملتے ۔ بلیوں اور کُتّوں کے لیے قسم قسم کے سر بند ڈبوں میں مختلف قسم کی غذائیں ملتی ہیں اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں ہمارے ہاں انسانوں کو بھی میسر نہیں ہے ۔ ٹیلی ویژن پر ہر روز بے شمار کتوں اور بلیوں کے کھانوں کے نہایت اشتہا انگیز اشتہار پیش کیے جاتے ہیں ۔ ایک دن یار خاں خاص طور پر ہم سے ملاقات کے لیے آئے اور بہت حیران ہو کر پوچھنے لگے ۔ " یار ۔ یہ بتاؤ کیا یہاں کے کُتّے بلیاں بھی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ؟"

ہم نے کہا ۔

" اور کیا ۔ ان کے لیے بھی تعلیم لازمی ہے ۔"

بولے ۔

" ٹھیک ہے ۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہ ان اشتہاروں کو پڑھے بغیر اپنی پسند کے کھانے کیوں کر انتخاب کرتے ہوں گے ۔"

ہیگ کو آبادی کی قلت اور وہاں کے لوگوں کے گھریلو اور سادہ طرزِ زندگی کے باعث " یورپ کا سب سے بڑا گاؤں " کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں شہروں جیسے ہنگامے، رونق اور شور شرابا نہیں ہوتا اور لوگ سرِ شام ہی اپنے اپنے گھروں میں پناہ لیتے ہیں ۔

ہالینڈ جزیروں پر مشتمل ایک بے حد خوب صورت مُلک ہے ۔ مختصر مگر انتہائی مہذّب اور ترقی یافتہ، یہاں پانی کی افراط ہے ۔ ہر جگہ جھیلیں اور نہریں موجود ہیں ۔ شہروں کے درمیان میں بھی نہریں بہتی ہیں جو شہروں کے حُسن میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں ۔ پھر جیسا کہ پہلے عرض کیا لوگ بے حد خلیق اور ملنسار ہیں ۔ ایک خاص بات یہ دیکھی کہ یہ لوگ پھولوں سے عشق کرتے ہیں ۔ ہر گھر میں پھولوں کی کیاریاں نظر آجاتی ہیں ۔ جن فلیٹوں میں باغ کی گنجائش نہیں ہے وہاں مکینوں نے مختصر سے ٹیرس یا کھڑکی میں پھولوں کے گملے سجا دیتے ہیں ۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں اور پھولوں کے درمیان پھول جیسے چہرے ۔ مگر عجیب بات دیکھی کہ سڑکوں اور بازاروں میں جا بجا پھول فروشوں کی مختلف سائز کی دکانیں بھی ہیں ۔ قیمت دریافت کی تو ہوش اُڑ گئے ۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب ہر طرف پھولوں کی افراط ہے تو پھر لوگ اتنے مہنگے داموں پھول کیوں خریدتے ہیں ؟ بعد میں اس کی وجہ بھی معلوم ہو گی ۔ پھول وہاں ہر گھر اور باغ میں موجود ہیں مگر وہ صرف خوشنمائی کے لیے ہیں ۔ انھیں دیکھا تو جا سکتا ہے توڑا نہیں جا سکتا ۔ توڑنے والے پھولوں کے باغات علیحدہ ہوتے ہیں اور میل ہا میل تک پھیلے ہوتے ہیں ۔ بازار میں فروخت ہونے والے پھول صرف ان ہی باغات سے آتے ہیں اور کیونکہ ہالینڈ کے لوگ تحفے میں پھول پیش کرنا پسند کرتے ہیں اس لیے پھولوں کے گلدستے اور ڈالیاں بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں ۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ وہاں پھولوں کی دکانیں اسی کثرت

سے ہیں جس طرح لاہور میں تکّے کباب اور چاپنوں کی دوکانیں۔ اور یہ بہت منفعت بخش کاروبار ہے۔ ایک اور خاص بات یہ نوٹ کی کہ (۱۹۸۳ء میں) وہاں کے عام لوگ نہ صرف پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے بلکہ اس کے لیے دوستانہ جذبات بھی رکھتے تھے۔ ہمارے ہوٹل کے چوکیدار صاحب ایک ریٹائر فوجی تھے۔ جب باتیں کیں تو پتہ چلا کہ وہ پاکستان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ حالانکہ یورپ اور امریکہ کے دوسرے ملکوں میں معلوماتِ عامّہ کا یہ معیار نہیں ہے۔ کافی دیر تک وہ پاکستان اور ۱۹۶۵ء کے حوالے سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلّقات کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ہم ان کی معلومات آفرینی پر حیران رہ گئے۔ آخر ہم نے پوچھا۔

"مسٹر کلارک۔ آپ کی معلومات ہمارے ملک کے بارے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

انھوں نے ہنس کر اپنے مصنوعی دانتوں کی نمائش کی اور بولے۔

"میرے دوست۔ وجہ یہ ہے کہ ہالینڈ میں تعلیم کا اوسط بہت زیادہ ہے اور یہاں کے لوگ مطالعے کے بہت شوقین ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ لوگ خالی اوقات میں کتابیں اور اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ بس یہی ان کی معلومات کا ذریعہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے ملک نے ایک بہت خوبصورت اور عالی دماغ خاتون کو ہالینڈ میں اپنا سفیر مقرر کرکے بھیجا جبکہ کسی یورپی ملک نے بھی اس سے پہلے یہاں کوئی خاتون سفیر نہیں بھیجا۔ ہم لوگوں کو یہ بات بھی پسند آئی اور پھر آپ کی سفیر نے ہالینڈ میں پاکستان کو متعارف کرانے کے لیے بہت کام کیا ہے۔ وہ یہاں بہت مقبول تھیں۔"

اُن کا اشارہ بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی طرف تھا۔

ہیگ کے گردو نواح میں بے شمار تفریحی مقامات اور باغات ہیں۔ مگر سب سے انوکھی اور قابلِ دید چیز "ٹیولپ کے کھیت" ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ٹیولپ ایک انتہائی خوبصورت، بجلی کے بلب کی شکل کا پھول ہوتا ہے اور مختلف رنگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ٹیولپ کی پیداوار کے لیے ہالینڈ دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہت وسیع پیمانے پر ٹیولپ کی کاشت ہوتی ہے۔

جہاں تک نگاہ جاتی ہے ٹیولپ کے کھیت ہی کھیت نظر آتے ہیں اور ہالینڈ والے اپنی خوش ذوقی کے پیشِ نظر مختلف رنگوں کے پھول ایک ترتیب اور مختلف قطاروں میں لگاتے ہیں یہ ایک انتہائی دل کش اور دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔ ان کھیتوں کو کاٹنے کے لیے جدید ترین مشینوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اس کے بعد انھیں نہایت جدید سائنٹیفک طریقے سے پیک کرکے بڑی احتیاط کے ساتھ دُنیا بھر میں ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے۔ فقط ٹیولپ کے پھولوں کی برآمد کے ذریعے ہالینڈ ہر سال کروڑوں ڈالر کماتا ہے۔ دودھ کی مصنوعات، جدید ترین کیمیکلز، پانی کے جہاز، ہوائی جہاز، موٹر کاریں اور دیگر مشینیں اور آلات، خدا جانے کیا کیا یہ چھوٹا سا ملک بناتا ہے۔ ان لوگوں کی جفاکشی اور بلند ہمتی کے باعث ایک زمانے میں اس چھوٹے سے ملک نے بھی دُنیا بھر میں اپنی نوآبادیاں قائم کر دی تھیں اور فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے۔ لیکن آج کے ہالینڈ کو دیکھیے تو یہ ایک امن پسند اور جمہوری ملک ہے۔ یہ مختصر ملک، اپنی نوآبادیوں سے محروم ہونے کے باوجود انتہائی خوشحال اور ترقی یافتہ ہے۔ اس کے سائز کو دیکھیں، اس کے وسائل کو سامنے رکھیں اور پھر اس کی پیش قدمیوں کو دیکھیں تو نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ خود سے مقابلہ کرنے کے بعد شرمندگی کا احساس بھی ہوتا ہے رقبے میں یہ مختصر ہے، جس کا بیشتر حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ ملّاحی اور کشتی رانی کی صنعتوں

ہیں اس نے بہت کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ یورپ کی اقوام کو دیکھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی سربلندی کا سبب کیا ہے۔ ہمیں بھی قدرت نے وسائل سے مالا مال کیا ہے اور کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں بخشی۔ لوگوں کو دیکھئے تو حد درجہ جفاکش اور اَن تھک، نہ صرف جسمانی طور مضبوط ہیں بلکہ ذہنی صلاحیتوں کے معاملے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم ترقی یافتہ اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ دن بدن ہمارے اور ان کے درمیان جو فرق ہے وہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ وہ مسلسل آگے کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں جبکہ ہم ترقی معکوس کر رہے ہیں۔ بلکہ جو تھوڑی بہت خوبیاں ہمارے اندر باقی رہ گئی تھیں رفتہ رفتہ ان سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا جانے واپسی کا یہ سفر کب، کیسے اور کہاں جا کر ختم ہو گا؟ خاص طور پر یورپ کے ملکوں میں سفر کرنے سے تو یہ احساس بہت شدّت سے ستانے لگتا ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار و اختیار، بڑے افسر، مختلف شعبوں کے ماہرین، مختلف محکموں کے نمائندے، دانش ور، صحافی، عام لوگ اب تو سبھی عموماً، ان ملکوں میں جاتے رہتے ہیں اور ان کی خوبیاں اور ترقیاں بھی دیکھتے ہیں۔ تو پھر احساس کیوں نہیں کرتے؟ اور اگر محسوس کرتے ہیں تو اس کا کوئی نتیجہ خیز اثر کیوں نہیں دیکھنے میں آتا؟ یہی سوچ سوچ کر ہم اپنا دل جلاتے رہے۔

ہیگ کہنے کو چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں سے بھی زیادہ خوشنما اور آراستہ۔ دکانیں اور بازار دیکھئے تو رشک آتا ہے۔ شاپنگ سینٹروں میں جابجا آرائش کا اہتمام کیا گیا ہے اور پھولوں کے گملوں سے بازاروں کو سجایا گیا ہے۔ شیشے اور پلاسٹک سے ڈھکے ہوئے بازار بھی ہیں اور ان بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومنا پھرنا بذاتِ خود ایک مسرت انگیز تجربہ ہے۔ ساحل پر خوب رونق ہوتی ہے۔ "سی فوڈ" کے ریسٹورنٹ اور مختلف قسم کی تفریحات اور کھیل۔

ہمیں ذاتی طور پر "سی فوڈ" پسند نہیں ہے۔ یوروپین کھانا بھی زیادہ مرغوب نہیں ہے۔ چنانچہ جس شہر میں جاتے ہیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں پاکستانی کھانا دستیاب ہو یا پھر اس سے ملتا جلتا کھانا مل جائے۔ یورپ کے اکثر شہروں میں اُس زمانے میں انڈین رسٹوران موجود تھے۔ بعد میں بعض شہروں میں پاکستانی رسٹوراں بھی قائم ہو گئے۔ ہیگ کے ایک بہت شہرت یافتہ انڈین ریسٹوران میں ہم بھی گئے۔ اس قسم کے رسٹوراں بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ مگر خیر۔ دل پر پتھر رکھ لیا۔ رسٹوراں کا نام تھا "بالی"۔ اندر سے اس کی آرائش اور کھانا سبھی ملغوبہ تھا۔ مثلاً یوروپین ویٹرس لڑکیاں ساڑھیوں میں ملبوس تھیں مگر کسی ایک نے بھی ڈھنگ سے ساڑھی نہیں باندھی تھی اور ہندوستانی لباس اور بالوں کے جُوڑوں میں بالکل کارٹون نظر آتی تھیں۔ ہوٹل کی سجاوٹ بھی آدھی تیتر، آدھی بٹیر قسم کی تھی۔ کہیں مغربی فرنیچر اور کسی جگہ ہندوستانی مونڈھے اور حُقّے وغیرہ۔ یورپ والوں کے لیے ممکن ہے اس میں کوئی کشش یا جدّت ہو، ہم لوگوں کو تو یہ سب کچھ انتہائی مضحکہ خیز لگا۔ کھانے کا مینو دیکھا تو عجیب و غریب قسم کے نام۔ بہت سی چیزوں کے آگے "مغلئی" کا لفظ بڑھا کر اسے کلاسیکل رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ کھانا منگایا تو شکل و صورت ہی بالکل عجیب سی لگی۔ صاف لگتا تھا کہ پکانے والا دیسی نہیں ہے۔ کھا کر دیکھا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ لیکن بہت مہنگا کھانا تھا اِس لیے قہر درویش بجان درویش کے مطابق زہر مار کیا۔ سارے رسٹوراں میں جو واحد خالص دیسی اور مشرقی چیز تھی وہ ایک ستار نواز تھا جو ایک کونے میں چوکی پر بیٹھا سچ مُچ کا اصلی ستار بجا رہا تھا۔ ہمیں تو یہ تجربہ بہت واہیات لگا مگر معلوم ہوا کہ پورے شہر میں اس انڈین رسٹوراں کی دھاک بیٹھی ہوتی ہے اور غیر ملکی جوق در جوق آتے ہیں۔

کھانے کے سلسلے میں ایک بات اور سن لیجیے۔ اداکارہ شبنم کے شوہر میوزک ڈائریکٹر روبن گھوش بھی یونٹ کے ہمراہ تھے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس شہر میں بھی جاتے پیدل گھومتے پھرتے اور کہیں نہ کہیں دیسی کھانے کا ہوٹل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ پیرس میں بھی انھوں نے انتہائی دُور دراز علاقے میں ایک تندور نما ریسٹوراں دریافت کر لیا تھا جہاں چاول اور دال دستیاب تھی مگر مُرغ سے بھی زیادہ مہنگی۔ ہیگ میں وہ خالص دیسی کھانا تو تلاش نہیں کر سکے مگر ایک ریسٹوراں میں ایسی ڈش دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے جو دیکھنے میں پلاؤ اور ذائقے میں مسور کی دال کی طرح تھی۔ خدا جانے اس کا نام کیا تھا۔ پیرس میں بھی کھانے کی پرابلم ہی رہی تھی۔ اکثر تو ہم آملیٹ اور مکھن ٹوسٹ پہ ہی گزارہ کرتے رہے۔ مگر پیرس کا ایک رواج ہمیں بہت پسند آیا۔ پیرس میں روٹیاں لمبی لمبی ڈنڈوں کی شکل کی ہوتی ہیں۔ انھیں ٹکڑوں میں کاٹ کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم پہلی بار ایک ریسٹوراں میں گئے تو دیکھا کہ میز پر ایک ٹوکری میں روٹی کے ٹکڑے اور ایک پیالی میں مکھن رکھا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ نے جس کھانے کا آرڈر دیا ہے جب تک وہ تیار ہو اس دوران میں آپ روٹی مکھن چکھتے رہیں۔ ہم نے بھی چکھی اور انتہائی خوش ذائقہ لگی۔ ہمارے ساتھیوں کی بھی یہی رائے تھی۔ نتیجہ یہ کہ جب تک کھانا آتے ہم نے ساری روٹی اور تمام مکھن چٹ کر لیا۔ ویٹریس آرڈر لے کر آتی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چکھنے والی روٹی اور مکھن غائب ہے۔ اِس روٹی اور مکھن کا معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا۔ ہمیں یہ سسٹم بے حد پسند آیا۔ پھر تو ہم نے معمول بنا لیا کہ کھانے کا آرڈر تو برائے نام ہوتا مگر اس کے آتے آتے روٹی اور مکھن سے شکم سیر ہو جاتے۔

ہیگ میں ہمارا قیام ایک ہفتے کے قریب رہا۔ موسم ٹھنڈا ضرور تھا لیکن دھوپ نکلی رہی۔ گھومنے پھرنے کا لُطف بھی آیا اور شوٹنگ کی رفتار بھی تیز رہی۔ ایک

روز ٹیولپ کے کھیتوں میں شوٹنگ کا پروگرام تھا۔ یہ ٹیولپ کے پھل پھلاؤ اور کٹائی کا موسم تھا۔ دیکھا کہ ایک صاحب ٹریکٹر نما گاڑی پر سوار ہیں۔ انھوں نے کھیتوں کے سامنے شوٹنگ کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا مگر کہا کہ ہم پھولوں کی کٹائی کر رہے ہیں۔ آپ اس سے پہلے شوٹنگ کر لیں۔ پرویز ملک صاحب خوشی خوشی ہوٹل واپس آتے۔ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹیولپ کے کھیتوں کی جگہ صفاچٹ میدان پڑا ہے۔ کچھ دیر پہلے جہاں کئی کئی فرلانگ تک پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا اب وہاں محض چند گز جگہ میں پھول باقی رہ گئے ہیں۔ اُس اللہ کے بندے نے ایک گھنٹے میں ہی سارے کھیت کاٹ کر پھینک دیتے۔ اس سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ لوگ کس برق رفتاری سے کام کرتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد ہم بذریعہ ٹرین، بحری جہاز کے ذریعے ہیگ سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔

لندن

آپ شاید یہ سُن کر حیران ہو رہے ہوں گے کہ بذریعہ ٹرین مگر بحری جہاز کے ذریعے سفر کا کیا مطلب ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہالینڈ سے انگلستان جانے کے لیے رُودبارِ انگلستان کو عبور کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر "فیری" کے ذریعے طے کیا جاتا ہے۔ مسافر انگلستان کے ساحل پر پہنچ کر دوبارہ ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔ رُودبارِ انگلستان کو عبور کرنے کے لیے فرانس اور ہالینڈ وغیرہ سے فیری کے ذریعے بحری سفر خاصا مقبول اور نسبتاً ارزاں ہے۔ جو لوگ ذاتی کاروں کے ذریعے سفر کرتے ہیں وہ بھی فیری ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ اپنی کار لے کر فیری میں داخل ہو جائیں اور اگر چاہیں تو سفر کے دوران کار ہی میں بیٹھے رہیں۔ دوسرے ساحل پر پہنچ

کہ آپ کی کار فیری سے باہر نکل جائے گی اور آپ پھر اپنے سفر پر گامزن ہو جائیں گے۔

"فیری" خاصی آرام دِہ اور خوبصورت تھی۔ یوں سمجھئے چھوٹے سائز کا بحری جہاز تھا۔ آسائش اور آرام کی ہر چیز اُس میں مہیا تھی۔ یہ قریبًا ساڑھے چار پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ فیری میں سلیپنگ برتھ کا بھی بندوبست ہوتا ہے۔ اگر کوئی سونا یا آرام کرنا چاہے تو معمولی سی اضافی رقم دے کر سلیپنگ برتھ بھی لے لے اور اپنی مرضی کے مطابق سوتے جاگتے سفر طے کرلے۔ مگر عمومًا سفر اس قدر دلچسپ اور خوبصورت ہوتا ہے کہ سونے کو کس کافر کا دل چاہتا ہے اور عام طور پر لوگ عرشے پر، ریسٹوران میں یا ڈیوٹی فری شاپ میں ہی وقت گزارتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ سفر اس لیے بھی دلچسپ اور ہیجان خیز تھا کہ یہ ہمارا پہلا بحری سفر تھا۔ اس سے پہلے ہم نے کسی تالاب یا جھیل میں بھی کشتی رانی نہیں کی تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پانی سے ہمیں بہت ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے ندی نالوں کی تو بات ہی کیا ہے۔ اگر باتھ ٹب بھی قدرے بڑے سائز کا ہو اور پانی سے لبالب بھرا ہوا ہو تو ہم اس میں قدم دھرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ پھر یہ تو باقاعدہ سمندر تھا۔ کچھ دیر تو ہم ڈرے اور سہمے رہے مگر پھر سمندر کی تازہ اور فرحت بخش ہوا اور ماحول کی رنگینی نے طبیعت میں جولانی پیدا کردی۔ مسافروں کی بہت بڑی اکثریت یوروپین خواتین اور مردوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تعداد سیّاحوں کی تھی۔ یورپ کے بیشتر ملکوں کے لوگ انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ ہنس مُکھ اور خوش مزاج ہوتے ہیں اور سیر و سیاحت کے دوران میں تو بڑے سے بڑا خشک طبیعت اور بدمزاج شخص بھی ماحول کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور ہنسی کھیل میں شریک ہوجاتا ہے۔ چنانچہ نوجوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھے جوڑے فیری میں اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔

تصویریں اُتار رہے تھے، ناچ گانے میں مصروف تھے۔ ایک صاحب کھڑے چند نوجوانوں کو رُود بارِ انگلستان کی تاریخ بتا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ انگلستان والوں کے دفاع کے لیے یہ خلیج ہمیشہ بہت کام آتی رہی ہے۔ ہمارا سمندر کا خوف دُور ہوچکا تھا اور ہم واقعی سمندری سفر سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک دو خوش جمال لڑکیوں نے "ایکسکیوزمی" کہہ کر ہمیں چونکا دیا اور ایک عدد کیمرہ ہماری طرف بڑھاتے ہُوئے التماس کی کہ ہم ان دونوں کی تصویریں بنا دیں۔ ہم نے فوراً یہ خوشگوار فریضہ ادا کیا، جواب میں انھوں نے ہمیں کافی پلائی۔ ان میں سے ایک امریکی تھی اور دوسری ناروے سے تعلّق رکھتی تھی۔ فیری کے سفر میں ملاقات ہوئی تو دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دونوں نے پہلے تو اکیلی تصاویر بنائیں اور پھر دونوں کی یکجا تصویریں بنانے کے لیے ہماری خدمات حاصل کیں۔ بعد میں دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ امریکی لڑکی کراچی کا سفر بھی کرچکی تھی اور اس شہر میں اسے سب سے زیادہ جو چیز بھاتی وہ اونٹ تھا۔

"اور گدھا گاڑی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہم نے پوچھا۔

کہنے لگی۔

"ہاں وہ بھی اچھی چیز ہے مگر مَیں نے اس میں سواری نہیں کی۔ یہ بتائیے کہ آپ لوگ خواہ مخواہ ایک گدھے کو ضائع کیوں کرتے ہیں؟"

ان کا اشارہ گدھے کے بچّے کی طرف تھا جو محض تکلفًا گدھے کے ساتھ چلتا ہے، حالانکہ گاڑی صرف ایک گدھا کھینچتا ہے۔

ہم نے کہا۔

"وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں گدھوں کی کمی نہیں ہے اِس لیے ایک ایڈیشنل گدھا پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر گدھا گاڑی کے گدھے کو فراہم کردیا جاتا ہے۔ دراصل

یہ بھی گدھوں کو بے وقوف بنانے کی ایک ترکیب ہے۔ گاڑی کھینچنے والا گدھا یہی
سمجھتا ہے کہ سارا بوجھ صرف اسی کے کاندھوں پر نہیں ہے بلکہ دوسرا گدھا بھی
اس کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ حالانکہ دوسرا صرف مورل سپورٹ دینے کے لیے تیار
ہے۔"

مگر وہ کافی بھلی قسم کی لڑکی تھی۔ کہنے لگی۔
"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ محض ایک گدھے کو بے وقوف بنانے
کے لیے آپ دوسرے گدھے کو بلا وجہ ضائع کر دیتے ہیں۔ یا تو دوسرے
کو بھی گاڑی میں لگا دیں یا پھر ایک ہی گدھے سے کام چلائیں۔ آخر
دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی تو ہر جگہ صرف ایک گدھا ہی سارے
کام کرتا ہے!"

ہم لاجواب ہو گئے مگر جب غور کیا تو سوچا کہ واقعی یہ کیا گدھا پن ہے؟ اسے
ہم ایک گدھے کی فضول خرچی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے اس اہم نکتے کی طرف توجہ
دلانے پر حسینہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم تمھارے یہ جذبات کراچی کے گدھوں
تک پہنچا دیں گے۔ ہم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ گدھا کیا چیز ہے ہم تو انسانوں کو بھی
بے دریغ ضائع کر دیتے ہیں۔

جب سمندر کے پانی پر سفید برف جیسے پرندے اُڑتے ہوئے نظر آنے لگے
تو پتہ چلا کہ اب زمین نزدیک ہے۔ یہ پرندے صرف خشکی کے آس پاس ہی پائے
جاتے ہیں، اور واقعی کچھ دیر بعد انگلستان کی سرزمین بھی نظر آنے لگی۔ صدیوں پہلے
جب انگریز تاجروں نے سوداگری کی غرض سے ہندوستان کی سرزمین کا رُخ کیا ہو
گا تو انھیں بھی اسی طرح زمین کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہو گی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم
ان کے ملک میں رہ کر اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرنے آتے تھے جب کہ وہ ہندوستان

سے روپیہ سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ فیری بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گئی اور ہم
سب نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ اس مختصر سے سفر میں کافی لوگ ایک
دوسرے کے شناسا بن گئے تھے۔ امریکی لڑکی نے نہ صرف ہم سے ہاتھ ملایا بلکہ...
خیر رہنے ہی دیجیے۔

سرزمینِ انگلستان

بندرگاہ کے راستوں سے گزر کر ہم ٹرین تک پہنچ گئے جو ہماری منتظر تھی۔ یہ
انگلستان کی سرزمین پر ہمارا پہلا وُرود تھا۔ درمیان میں ایک جگہ پاسپورٹ اور
ویزا بھی چیک کیا گیا۔ ڈین ہیگ سے فیری میں سوار ہوتے وقت بھی امیگریشن
والوں نے پاسپورٹ اور ویزا چیک کیے تھے۔ انگلستان کی ٹرین میں سوار ہوتے تو
یہ ہمیں فرانس کی ٹرین سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ فرانس کی
ٹرینوں میں نفاست اور نزاکت قدرے زیادہ تھی۔ اس سے قطع نظر کوئی اور قابلِ ذکر
فرق نہ تھا۔ ہم نے یار خاں کے ساتھ بطورِ خاص اِس ٹرین کے ایک سرے سے
دوسرے سرے تک مطالعاتی سفر کیا اور ڈائننگ کار میں پہنچ گئے۔ یار خاں کھڑکی
سے باہر جھانکنے لگے اور ہم نے چائے اور سینڈوچ کے لیے کاؤنٹر کا رُخ کیا۔ ایک
گورے ویٹر نے خالص انگریزی لہجے میں ہم سے پوچھا۔
"مَیں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

ظاہر ہے چائے کافی دینے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا۔ ہم نے دو کافی لانے کی
فرمائش کی اور وہ غائب ہو گیا۔ ہم کاؤنٹر پر کھڑے رہے۔ اتنی دیر میں ایک
اور انگریز مسافر آ کر ہمارے بازو میں کھڑا ہو گیا۔ اندر سے ایک اور ویٹر نے برآمد
ہو کر ان صاحب سے پوچھا۔

"فرمائیے۔ کوئی خدمت؟"

انھوں نے انگوٹھے سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھ سے پہلے آئے ہیں۔"

ہم تو اس نظم و ضبط، شائستگی اور خوش اخلاقی پر فریفتہ ہو گئے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمارا آرڈر ہو چکا ہے۔ تب کہیں جا کر اس نے اپنا آرڈر دیا۔ یہ انگلستان میں ہمارا پہلا اخلاقی تجربہ تھا۔ انگلستان اور یورپ بھر میں یہ رواج ہے کہ اگر صرف دو آدمی بھی کہیں منتظر ہوں گے تو ایک دوسرے کے پیچھے قطار بنا کر کھڑے ہوں گے اور کبھی دوسرے کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ ان لوگوں میں قطار بنانے کی عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ بقول یار خاں کے اگر قطار میں کھڑا ہونے کے لیے دوسرا آدمی نہ آ جائے تو وہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ تو مبالغہ ہے مگر ان لوگوں کی قطار بندی، صبر و تحمّل اور برداشت کی عادت واقعی قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے۔

اِس ٹرین میں زیادہ مسافر انگریز تھے اِس لیے نسبتاً خاموشی زیادہ تھی۔ یہ قوم بولنے کے معاملے میں بہت کفایت سے کام لیتی ہے اور یورپ کے دوسرے ملکوں (اور امریکہ) کے برعکس یہ زیادہ ہنس مُکھ بھی نہیں ہوتے۔ پاس سے گزرنے والوں کو دیکھ کر مسکرانے کی جگہ اکثر محض سر ہلانے پر اکتفا کرتے ہیں اکثر تو ایسا بھی نہیں کرتے۔ ٹرینوں اور دوسرے پبلک مقامات پر آپ یا تو لوگوں کو اخبار یا کتاب کے مطالعے میں غرق پائیں گے یا وہ اپنی ناک کی سیدھ میں خاموش ٹکٹکی لگائے بیٹھے خلا میں دیکھتے ہوتے ملیں گے۔ آپ بالکل ان کے سامنے ہوں پھر بھی وہ آپ سے نظر نہیں ملائیں گے کہ مبادا مُسکرانا یا بات کرنا ہی نہ پڑ جائے۔ اس کے مقابلے میں فرانس اور ہالینڈ میں لوگ ایک دوسرے سے نہ صرف گفتگو کر لیتے ہیں بلکہ ہنستے بولتے بھی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے زمانے میں بھی یورپ اور انگلستان میں مطالعے کا

شوق بے پناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخباروں کی اشاعتیں بہت زیادہ ہیں اور کتابیں بھی لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں۔

ٹرین نے ہمیں لندن کے وکٹوریہ سٹیشن پر پہنچا دیا۔ یہ انتہائی وسیع اور مصروف سٹیشن ہے۔ بیرونِ ملک کے لیے بیشتر ٹرینیں یہیں سے چلتی ہیں اور مسافر بھی یہیں آتے ہیں۔ اِس لیے بے پناہ ہجوم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کے باوجود شور و غل اور بدنظمی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ہم اس سٹیشن کو دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوتے کیونکہ اس سے پہلے اٹلی، فرانس اور ہالینڈ کے ریلوے سٹیشن بھی دیکھ چکے تھے۔ انداز سب کا ایک ہی ہے۔ سوائے اس کے کہ انگلستان میں زیادہ تر لوگ انگریزی بولتے ہوئے ملتے ہیں جس کی وجہ سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر جگہ سائن بھی انگریزی میں ہی لکھے ہوتے ہیں اور اکثر تو اسی انداز سے لکھے جاتے ہیں جیسے ہمارے ملک میں ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ ہمارے ملک میں بھی تو یہ سب انگریزوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ انھوں نے اُسی طرز پر یہاں بھی سب کام کیے اور تعمیرات کیں جس انداز میں ان کے اپنے ملک میں ہوتا ہے۔

پلیٹ فارم سے باہر نکلے اور ٹیکسیوں کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ ٹیکسیاں گزری چلی جا رہی ہیں۔ ہمارے اشاروں اور "ٹیکسی ٹیکسی" پکارنے پر کوئی نہیں رُکتا۔ راشد صاحب ناراض ہو کر بولے۔

"دیکھا آپ نے۔ کس قدر متعصب اور احساسِ برتری کی ماری ہوئی قوم ہے۔ ایشیائی لوگوں کو تو گھاس ہی نہیں ڈالتے یہ لوگ۔"

حالانکہ بعد میں پتہ چلا کہ ہمیں گھاس نہ ڈالنے کی وجہ ہماری رنگت نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ ہم ٹیکسی کے لیے قطار میں کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ یہاں ریلوے سٹیشن اور دوسرے مقامات پر رواج یہ ہے کہ مسافر قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں ٹیکسی آتی

ہے اور سب سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کو سمیٹ کر لے جاتی ہے۔

یہ رات کا وقت تھا مگر ہر طرف روشنیوں کی افراط کے باعث دن نکلا ہوا تھا۔ کم از کم ہمیں ایسا ہی لگا۔ سوال یہ تھا کہ اتنی رات گئے ہوٹل کہاں اور کیسے تلاش کریں، یہاں تو ہالینڈ کے وی۔ وی۔ وی کے نمونے کا کوئی ادارہ بھی نہیں تھا. جو ہماری مشکل آسان کرتا۔ مگر راشد صاحب کو کسی نے یہ گُر کی بات بتائی تھی کہ اگر سیّاحوں کے موسم میں ایڈوانس بکنگ کے بغیر لندن جائیں تو آنکھیں بند کر کے رسل سکوئر کے رائل ہوٹل پہنچ جائیں۔ وہاں تھوڑے بہت انتظار کے بعد کمرہ ضرور مل جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ اطمینان سے کوئی دوسرا ہوٹل تلاش کرلیں۔ گویا رائل ہوٹل پیر ٹکانے کی جگہ ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں کا قافلہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ واقعی بے حد لحیم شحیم ہوٹل ہے۔ ہزاروں کمرے ہیں مگر ملحقہ باتھ روم نہیں ہیں۔ اس ہوٹل کی لابی میں چوبیس گھنٹے سینکڑوں مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بیشمار لوگ ہوٹل سے رخصت ہوتے رہتے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ ہوٹل کی لابی کیا ہے اچھا خاصا شہر ہے۔ حسبِ توقع کمرے خالی نہیں تھے مگر خاتون نے ہمیں نمبر دے کر وسیع و عریض لاؤنج میں تشریف فرما ہونے کو کہا۔ ہم وہاں بیٹھ کر سیر دیکھنے لگے یہ وہ زمانہ تھا جب دُنیا بھر میں ہپیوں کا کلچر بہت عروج پر تھا۔ یہاں بھی کافی تعداد میں ہپّی لڑکے اور لڑکیاں نظر آئے۔ دوسرے مسافروں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ مختلف ملکوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے مرد اور عورتیں اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ یہ بذاتِ خود ایک تفریح ہے۔ کچھ دیر بعد ہم سب کو کمرے مل گئے۔ کمروں میں سامان رکھنے کے فوراً بعد ہم نے آس پاس کا علاقہ دیکھنے کا قصد کیا۔ ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آئے۔ سامنے ایک ایشیائی قسم کے صاحب بہادر آ رہے تھے۔ ہم نے بڑی مصفّا اور مسجّع انگریزی میں ان سے پوچھا کہ اس علاقے کا انڈر گراؤنڈ سٹیشن کہاں

انھوں نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور پھر اُردو میں بولے، "دیکھئے۔ آپ سامنے جا کر بائیں ہاتھ مُڑ جائیے . . . ." پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ وہ ہم سے اُردو بولنے لگے ہیں تو رُک گئے اور باقی فقرہ انگریزی میں اَدا کرنے لگے۔ ہم نے فوراً کہا "نہیں نہیں۔ اُردو ہی میں بات کیجئے۔"

وہ مُسکرائے اور بتا کر رخصت ہو گئے۔ لندن کے بارے میں یہ ہمارا پہلا تاثر تھا۔ کہاں تو یورپ کے وہ شہر جہاں ہمارا کوئی ہم زبان ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا. اور ہم انگریزی بولنے والے کے لیے ترس جاتے تھے اور کہاں یہ ملک جہاں پہلے ہی ملاقاتی نے ہماری اپنی قومی زبان میں ہم سے بات شروع کردی۔ بعد میں لندن (اور انگلستان کے اکثر مقامات) کی یہ خصوصیت ہمیں بہت بھاتی۔ یہاں ہر جگہ آپ کو اُردو پنجابی بولنے والے مِل جاتے ہیں۔ اگلے چند سالوں میں تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ لندن میں انگریزی بولنے والوں کے مقابلے میں اُردو، پنجابی بولنے والے زیادہ ملتے ہیں۔ آپ کسی بھی جگہ چلے جائیں کسی نہ کسی گوشے سے آپ کو اِن زبانوں میں باتیں کرنے والوں کی آواز سنائی دے جائے گی۔ لندن میں ہر شئے جانی پہچانی اور دیکھی دیکھی سی لگتی ہے۔ اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں کہ اگر ہمارے ہی مُلک کے علاقوں کو زیادہ صاف اور منظّم کر دیں تو کوئی فرق ہی محسوس نہ ہو۔ بلکہ بعض شہروں کے بعض علاقوں میں تو یہ فرق بھی باقی نہیں رہتا۔ خالص ایشیائیوں کے علاقوں میں ہو بہو وہی نقشہ نظر آتا ہے جو ہمارے اپنے ملک میں ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بھی بہت حیرت ہوئی کہ لندن اور انگلستان کے بعض شہروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو پندرہ بیس سال سے وہاں مقیم ہیں پھر بھی انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ محض "یس اور نو" سے کام چلاتے ہیں۔ اوّل

تو عموماً ان کا انگریزوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ یا پھر انگریز ان کی اردو اور پنجابی آمیز انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔

تھوڑی دُور ٹہلنے کے بعد ہم واپس ہوٹل آ کر سو گئے۔ صبح اُٹھے تو غسل خانے کی کمی محسوس ہوئی۔ ہاتھ منہ دھونے کے لیے ہر کمرے میں بیسن تو ہوتا ہے مگر نہانے اور دوسرے کاموں کے لیے کامن باتھ روم کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ہم چونکہ دیر میں بیدار ہوتے تھے اس لیے تمام غسل خانے قریب قریب فارغ ہی تھے اور قطار بندی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر جگہ اُجلے تولیے اور صابن موجود تھے۔ صفائی ایسی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنے ڈھیر سارے لوگ اس غسل خانے کو استعمال کر چکے ہیں۔ ایک خاتون نے نمودار ہو کر ہم سے پوچھا کہ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہم نے شکریہ اَدا کر دیا۔ نیچے اُترے کھانے کے مختلف وسیع کمروں میں سینکڑوں لوگوں کے لیے ناشتے کا اہتمام تھا۔ یورپ کے ہوٹلوں میں ناشتے کے لیے وقت مقرر ہوتا ہے۔ مقررہ وقت کے بعد ناشتہ دستیاب نہیں ہوتا۔ رائل ہوٹل میں کیونکہ ہزاروں مسافروں کا ہجوم ہوتا ہے اس لیے یہاں ناشتے کا وقت گیارہ بجے تک تھا۔ ورنہ عام طور پر تو ساڑھے نو بجے تک ناشتے کا وقت ہے ہوتا ہے۔ اس کے بعد معذرت۔

رائل ہوٹل کے نزدیک ہی فلیٹ سٹریٹ واقع ہے جو اخباری صنعت کا مرکز ہے "اخبارِ وطن" کا دفتر بھی وہیں ایک گلی میں تھا۔ ہم "مشرق" کے چیف ایڈیٹر عنایت اللہ صاحب سے ملاقات کی غرض سے "اخبارِ وطن" کے دفتر پہنچے تو دیکھا کہ چند حضرات چپاتیاں لینے اور پان کھانے میں مصروف تھے۔ یہ ماحول دیکھ کر ہمیں انگریزی بولنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔ اُردو میں ہم نے ان سے عنایت صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور ٹھیٹ پنجابی میں انھوں نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ اس وقت رائل ہوٹل کے چھوٹے ریسٹورنٹ میں ملیں گے۔ دراصل عنایت صاحب دن میں دفتر کی جگہ

رائل ہوٹل کے ریسٹوران میں ہی بیٹھک کیا کرتے تھے۔ ہم واپس ہوٹل کے چھوٹے ریسٹوران میں گئے تو ایک کونے میں دُور ہی سے عنایت صاحب بیٹھے ہوئے نظر آ گئے۔ ان کے اردگرد چھ سات حضرات تشریف فرما تھے اور گپ شپ چل رہی تھی وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بغلگیر ہوئے اور شکایت کی کہ پہلے سے انھیں کیوں خبر نہیں دی۔ اس کے بعد انھوں نے چمچے سے پیالی کو بجا کر ایک لمبی تڑنگی ویٹریس کو مخاطب کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی تو بولے۔

" ایملی۔ وَن کپ فار مائی فرینڈ۔"

ایملی سر ہلا کر مسکراتی ہُوئی رخصت ہو گئی۔ چند لمحے بعد واپس آئی اُس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور پھر چائے لینے چلی گئی۔ یہ خاص پاکستان کے چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں کا طریقہ ہے جہاں عموماً صحافی اور دانشور صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں رواج یہ ہے کہ اگر چائے کا آرڈر دیں تو بیرا پہلے ایک پانی کا گلاس لا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد چائے یا کافی لا کے آتا ہے۔ عنایت صاحب نے رائل ہوٹل کے ریسٹوران کو بھی ٹھیٹ لاہوری ماحول میں رنگ لیا تھا۔ ہم نے ان کے اِس کارنامے پر عنایت صاحب کو مبارکباد بھی دی۔ پھر ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصے پیرس اور روم جا کر بھی قیام کریں اور وہاں کے ریسٹوران والوں کی عادتیں بھی "ٹھیک" کر دیں۔ ایملی چائے لے کر آئی ہم سے اُردو میں پوچھنے لگی۔

"کتنی چینی ؟"

ہم حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ تھی تو واقعی میم مگر اچھّے خاصے لہجے میں اُردو بول رہی تھی۔ عنایت صاحب ہنسے اور کہنے لگے۔

"حیران نہ ہوں، یہ تو پنجابی بھی بولتی ہے۔"

انگریز اور ہم

سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد پھر ہم لندن اور انگلستان کے دورانِ قیام میں کسی بات پر حیران نہیں ہوتے (ایک زمانہ تھا جب انگریزوں نے ہمارے مُلک پر دھاوا بول دیا تھا۔ مگر اب اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ اُن کے ملک پر ایشیائی لوگوں نے یلغار کر دی ہے۔ وہ بے چارے تو ہندوستان میں گنتی میں بہت کم تھے۔ ہمارے ایشیائی بھائیوں کی تعداد اب وہاں لاکھوں میں پہنچ گئی ہے اور جس تیز رفتاری سے یہ آبادی میں اضافہ کر رہے ہیں اس کے پیشِ نظر انگریزوں کو ڈر ہے کہ آئندہ بیس سال میں ان کے ملک میں مقامی باشندوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر ہم ایشیائی (بھارتی، پاکستانی بنگلہ دیشی) لوگوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آس پاس کے ماحول کا اثر بالکل قبول نہیں کرتے۔ اپنی عادتیں تبدیل کرنے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتے۔ لندن میں ہم نے پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کو خالص دیسی انداز میں رہتے ہوتے دیکھا ہے۔ وہاں کی تمیز، تہذیب اور ادب آداب سے وہ لوگ متنفر ہیں اور آج بھی اپنے پُرانے رنگ ڈھنگ اپناتے ہوتے ہیں۔ وہی بدنظمی، گندگی، شور و غل، دھکم پیل لڑائی جھگڑے۔ انگریز بے چارے پریشان ہونے میں حق بجانب ہیں۔ ان کی قوتِ برداشت واقعی تعریف کے قابل ہے ورنہ ہمارے لوگ وہاں جس انداز سے رہتے ہیں اسے انگریز تو کیا ہمارے گلبرگ میں رہنے والے بھی شاید برداشت نہ کر پائیں۔

ہم نے غور کیا، سوالات کیے، تجزیہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ایک طرح کا انتقا ہے جو ایشیائی باشندے انگریزوں سے لے رہے ہیں۔ مثلاً وہاں [illegible]گاری کا

وظیفہ ملتا ہے۔

چنانچہ ہمارے بے شمار لوگ کوئی کام کاج نہیں کرتے۔ گھر بیٹھے وظیفہ وصول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوری چھپے دیسی لوگوں کے پاس نوکری وغیرہ بھی کر لیتے ہیں جس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ نہ صرف انگریز کے خزانے سے ہفتہ وار وظیفہ وصول کرتے ہیں بلکہ ٹیکس بچا کر بھی خزانے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہاں یہ منظر عام ہے کہ شادی کو آٹھ سال ہوتے ہیں اور گھر میں پانچ بچے شور مچا رہے ہیں۔ پوچھا۔

"بھائی۔ خدا کا خوف نہیں کرتے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

جواب ملا۔

"اجی۔ اس کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ہر بچّے کی پیدائش پر حکومت سے وظیفہ ملتا ہے۔ زچگی، تعلیم، علاج معالجہ سب مفت ہے۔ تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت ہے؟"

یعنی وہی انتقامی جذبہ۔ اس سے متاثّر ہو کر ہم نے فلم "دوستی" میں ایک کردار تخلیق کیا جو ساقی صاحب نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا۔ یہ صاحب لندن میں نوسر بازی کرتے ہیں اور برِّصغیر سے آنے والے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ دکانوں میں جاتے ہیں تو چیزیں چُرا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ ایک موقعے پر ان کا ایک پاکستانی دوست ان کے ساتھ شاپنگ سنٹر میں جاتا ہے۔ دونوں گھر واپس آتے ہیں تو ساقی صاحب اپنے اوورکوٹ کے اندر سے بے شمار سامان نکال کر ڈھیر لگا دیتے ہیں جو وہ چوری کر کے لاتے ہیں۔ دوست حیران ہو کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

"تمھیں شرم نہیں آتی۔ اتنا بہت سامان چُرا کر لے آتے ہو؟"
ساقی صاحب ڈھٹائی سے جواب دیتے ہیں۔
"شرم کس بات کی؟ اس قوم نے بھی تو ہمیں برسوں تک لُوٹا ہے
ہم نے تھوڑا بہت ہاتھ صاف کر لیا تو کیا بُرائی ہے؟"

انگلستان کے بارے میں اس وقت تک پاکستان میں رہنے والوں کو اصل حالات کا علم نہیں تھا۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ جو شخص وہاں کام کے لیے جاتا ہے عیش کی زندگی گزارتا ہے۔ بے شمار روپیہ کماتا ہے۔ کاروں میں گھومتا ہے۔ عالیشان مکانوں میں رہتا ہے۔ وہاں سے واپس آنے والے بھی اہلِ وطن کو اپنے عیش و عشرت کی فرضی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ خاص طور پر ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے دیہاتیوں کی زندگی تو عذاب ہی تھی۔ وہاں یہ لوگ سخت مشقت اور محنت مزدوری کر کے بہت کم پیسے کمایا کرتے تھے جس میں سے ایک بڑا حصہ انھیں اپنے اُن ہم وطنوں کے حوالے کرنا پڑتا تھا جو انھیں ملازمت دلواتے تھے۔ وہ لوگ انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح کمروں میں رکھتے تھے۔ ایک ایک کمرے میں بیس بیس فرد رہا کرتے تھے اور ان کی رات اور دن کی علیحدہ علیحدہ باری ہوا کرتی تھی۔ رات کو کام پر جانے والے دن میں اور دن میں کام کرنے والے رات کو فرش پر ایک ہی بستر استعمال کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی نوکری کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ بہت مصیبت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اِدھر وطن میں ان کے دُوست اور رشتے دار یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے لندن میں جا کر دُنیا کی تمام نعمتیں حاصل کر لی ہیں۔ مَیں نے اِن لوگوں کے روز و شب بھی فلم میں دکھائے جس کی وجہ سے یہ فلم سمندر پار بنائی جانے والی ہندوستانی اور پاکستانی فلموں میں موضوع اور حقیقت کی عکاسی کے اعتبار سے پہلی اور انوکھی فلم بن گئی۔ یہ تو عام لوگوں کا حال

تھا، جو لوگ وہاں قسمت کی مہربانی اور محنت کے بل پر دولت مند ہو گئے تھے وہ معاشرتی مسائل میں گرفتار تھے۔ جن لوگوں نے جوشِ جوانی میں انگریز عورتوں سے شادی کر لی تھی۔ جوانی کا اُبال ختم ہونے اور اولاد کی پیدائش کے بعد وہ اب خون کے آنسو رو رہے تھے۔ اس قسم کے کرداروں کو بھی بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ "دوستی" میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر مَیں نے بھی انگلستان کے بارے میں یہ کہانی لاہور میں بیٹھ کر لکھ دی ہوتی تو شاید یہ بھی دوسری فلموں کی طرح ایک عام خیالی اور فرضی کہانی بن کر رہ جاتی۔

انگلستان کے پہلے ہی دورے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ہندوستانی اور پاکستانی گھرانے مادّی دولت اور جدید سہولتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود اس ماحول میں خود کو اجنبی اور غیر مانوس محسوس کرتے ہیں اور اپنے عاجلانہ فیصلے پر پچھتا رہے ہیں۔ ان کی اولاد کی پرابلم اور بھی زیادہ ہے۔ انھیں مغربی ماحول میں پرورش پانے کا موقع ملتا ہے مگر گھر کی چار دیواری کے اندر ماں باپ انھیں خالص پاکستانی دیکھنا چاہتے ہیں اور مشرقی اقدار کے مطابق ان کی پرورش کرنے کے خواہش مند ہیں، جو بچّوں کے لیے انتہائی حیران کُن اور ناقابلِ عمل صورتِ حال ہے۔ ان کی ایک اور پرابلم یہ ہے کہ وہ دوہری شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں اور شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انگلستان میں انھیں غیر یورپین اور ایشیائی سمجھ کر ان سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے جبکہ اپنے باپ دادا کے ملک کے طور طریقوں اور ماحول سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہاں بھی انھیں اجنبی ہی تصوّر کیا جاتا ہے۔ وہ اِن دونوں جہانوں میں سے کسی ایک کے بھی نہیں رہتے۔ مَیں نے بعد میں یورپ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کے بے شمار سفر کیے اور ہر قسم کے پاکستانیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ مَیں نے ان میں سے ۹۹ فیصد کو اپنے وطن واپس جانے کی آرزو میں

مبتلا دیکھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے وطن واپس چلے جائیں تو وہ زندگی کیسے گزاریں گے۔ اور جس معیارِ زندگی کے وہ عادی ہو چکے ہیں وہ انھیں وطن میں کیونکر حاصل ہو سکے گا؟ مغرب میں رہنے والے پاکستانیوں کو وطن واپس آنے کی چاہت بھی بہت ہے مگر راہ میں مشکلات بھی کم نہیں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں وہ جس قدر اوپر کما رہے ہیں (بعض مخصوص اور معدودے چند لوگوں کے علاوہ) اس کا دسواں حصہ بھی پاکستان میں نہیں کما سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ملازمتوں اور کاروبار کے ذرائع بہت محدود ہیں اور جو میسر بھی ہیں تو وہ صلاحیت اور حقوق کی بنیادوں پر نہیں ملتے بلکہ سفارش، قرابت داری یا رشوت و اثر و رسوخ کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لوگوں کی ایک اور مشکل بھی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں اور ایسے علوم میں مہارت حاصل کرتے ہیں جن کی ترقی یافتہ ملکوں میں بہت قدر ہونی چاہیے لیکن ہمارے ملک میں کوئی انھیں پوچھتا بھی نہیں۔ انھیں معاوضے بہت کم دیئے جاتے ہیں اور اکثر اوقات انھیں ان کے مخصوص شعبوں میں کام کرنے کی سہولت حاصل نہیں ہوتی۔

میں ایسے بہت سے ڈاکٹروں، انجینئروں اور سائنس دانوں کو جانتا ہوں جو وطن کی محبت میں ہر چیز قربان کر کے واپس آ گئے مگر انھیں نظر انداز کیا گیا اور اُن مخصوص شعبوں میں استعمال نہیں کیا گیا جن میں انھوں نے مہارت حاصل کی تھی۔ اِن باتوں کے علاوہ ایک اور مسئلہ رہن سہن اور طرزِ زندگی کا بھی ہے۔ مغربی ممالک میں روزمرّہ زندگی بہت سکون سے گزرتی ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں روزمرّہ ہزاروں بلاوجہ کی مصیبتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہاں پیدا ہونے والے کم سن بچے تو خیر اس فرق کو بہت ہی زیادہ محسوس کرتے ہیں مگر وہاں چند سال گزارنے والے لوگ بھی اپنے معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کا سامنا کرتے ہوئے بہت پریشانی محسوس کرتے

ہیں۔ ہمارا پورا نظام بدقسمتی سے بدعنوانیوں، لاپروائیوں، بےعملیوں اور کاہلی کا شکار ہو چکا ہے۔ ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ ہر دفتری کام ایک مرحلہ ہے۔ جبکہ مغرب میں دفتری کام اور روزمرّہ کی عام ضروریات کسی پریشانی یا تردّد کے بغیر ہی حل ہو جاتی ہیں۔ اِس کے باوجود بہت سے لوگ پاکستان واپس آتے مگر یہاں کے حالات اور غیر صحت مند ماحول سے تنگ آ کر واپس لوٹ گئے۔ میں نے بے شمار ایسے دولت مند اور کامیاب پاکستانی دیکھے ہیں جو وہاں دولت میں کھیل رہے ہیں مگر پھر بھی ان کا بس نہیں چلتا کہ پَر لگ جائیں اور وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ وہ ہر دم وطن کی سرزمین ہی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور واپسی کے لیے قسم قسم کے منصوبے بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی خوشحالی، خوش باشی اور آسائش کے باوجود مجھے ان کی ذاتی زندگی اَلم اور محرومی کی داستان ہی نظر آتی۔ اور ان کی آئندہ نسلوں کے لیے کاتبِ تقدیر نے کیا لکھ دیا ہے؟ اس کا تصوّر ہی روح فرسا اور تکلیف دہ ہے۔ کاش ہم اپنے ملک میں وطن کے ان فرزندوں کی واپسی کے لیے بہتر حالات اور سازگار ماحول پیدا کر سکتے۔

لندن میں دو دن رائل ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد ہم پکاڈلی سرکس کے ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ پکاڈلی سرکس لندن کی رگِ جاں ہے۔ بے شمار سڑکیں یہاں آکر ملتی ہیں۔ لندن کے بہترین شاپنگ سنٹر اس کے آس پاس واقع ہیں۔ ہوٹل، کلب، دوکانیں، ریسٹوران، تھیئٹر، سینما غرض ہر قابلِ ذکر اور قابلِ دید چیز پکاڈلی کے گرد و نواح میں موجود ہے۔ لندن پہنچتے ہی پہلی حاضری پکاڈلی سرکس میں دی جاتی ہے اور اس کے نواح میں گھومتے ہوئے آپ کو بے شمار شناسا چہرے نظر آ جاتے ہیں۔ سیّاحوں کا یہ بہت بڑا مرکز ہے۔ ہر طرف سیّاحوں کا اژدھام رہتا ہے۔ رات اور دن ہر وقت یہی صورتِ حال دیکھنے میں آتی ہے۔ پکاڈلی کے بیچوں بیچ

ایک چھوٹے سے باغ میں کبوتروں اور سیاحوں کا مجمع رہتا ہے۔ جن دنوں ہم
وہاں گئے ہپیوں کا دور دورہ تھا اور لندن دراصل ہپیوں کے قبضے میں تھا۔ جس
جگہ دیکھئے مختلف قوموں، ملکوں اور نسلوں کے ہپی لڑکے اور لڑکیاں گھومتے ہوتے نظر
آجاتے تھے۔ یہیں ہم نے پہلی بار "ہرے کرشنا، ہرے راما"، تحریک کے پیروکاروں
کا جلوس بھی دیکھا۔ سفید فام لڑکے سر منڈاتے اور ہندوؤں کی طرح سر پر لمبی چوٹیاں
بناتے جلوس کی صورت میں جارہے تھے۔ یورپین لڑکیاں بھی ہندو جوگنوں کے لباس میں
ہمراہ تھیں۔ وہ اشلوک وغیرہ بھی گاتے رہتے تھے مگر خالص انگریزی لب ولہجے میں۔
یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مذہب نے ساری دُنیا کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا خاص
طور پر مغربی اقوام اپنی مادیت اور بے سکونی سے تنگ آکر روحانی سکون کی تلاش
میں ہندو مذہب کے جوگیوں اور رشیوں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بہرحال
لندن میں اگر آپ نے پکاڈلی سرکس نہیں دیکھا تو سمجھئے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ہمیں یہ
آسانی تھی کہ جب چاہیے شاپنگ کی، گھومے پھرے اور ہوٹل میں جاکر آرام کرلیا۔
لندن کا پکاڈلی سرکس واقعی اپنی نوعیت کی انوکھی چیز ہے۔

لندن ہوش سنبھالتے ہی ہمارے خوابوں کا شہر بن گیا تھا۔ اس کے بارے
میں شروع ہی سے اتنا کچھ سُنا، پڑھا، تصویروں اور فلموں میں دیکھا کہ یہاں کی
ہر چیز اور ہر جگہ سے مانوس ہوگئے۔ لندن کا کوئی علاقہ اور کوئی قابلِ ذکر عمارت
ایسی نہیں تھی جس کے بارے میں ہم جانتے نہ ہوں۔ مگر جب انھیں اپنی آنکھوں
سے دیکھا تو اتنی دلکش اور خوبصورت نہیں لگیں جتنی تصویروں، فلموں یا تصور میں
نظر آتی تھیں۔ لندن ایک خوبصورت شہر ہے مگر انگریزوں نے دُنیا بھر میں اسے یوں
ضرب المثل بنا کر پیش کیا ہے اور اس کے بارے میں اتنے مبالغے سے کام لیا ہے کہ
جب اصل لندن کو دیکھو تو شروع شروع میں مایوسی ہونے لگتی ہے۔ مگر پھر یہ شہر

کلاسیکی راگوں کی طرح رفتہ رفتہ دل میں اُتر جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں سارے
شہروں سے زیادہ لندن ہی بھاتا ہے اور یہیں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ ہم بہانے بہانے لندن میں قیام ضرور کیا کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ
یہاں زیادہ سے زیادہ عرصہ گزاریں۔ لندن میں اگر آپ پیرس والی چمک دمک اور
نفاست تلاش کریں گے تو مایوسی ہوگی۔ عمارتیں دھوئیں سے کالی یا کائی سے سبزی
مائل۔ عمارتیں بھی بہت زیادہ جدید اور خوبصورت بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس شہر کے
پُرانے پن میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور حُسن ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا شہر ہے۔
انگریزوں نے دُنیا بھر پر حکمرانی کی اور سارے جہاں کی دولت سمیٹ کر لندن لے گئے
لندن کے در و دیوار آج بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ظاہری حُسن، دلکشی اور چمک دمک
سے محروم ہونے کے باوجود لندن ایک تاریخی شہر ہے۔ پُرشکوہ، عالیشان اور شاندار،
یورپ کے جدید شہروں، خصوصاً امریکہ اور کناڈا کے شہروں کے مقابلے میں لندن ایسا
ہی لگتا ہے جیسے گلبرگ کی جدید ترین کوٹھی کے مقابلے میں شالیمار یا شاہی قلعہ۔ اس کا
رُعب داب اور وقار ہی الگ ہے۔ پھر انگریزوں نے اپنے اکثر آداب و رسوم کو بھی
نہیں چھوڑا ہے اور اس قدامت پسندی نے لندن کو ایک نرالی شان بخش دی ہے۔

کاروبار، تجارت کے اعتبار سے یہ سالہا سال تک دُنیائے مغرب کا اعصابی مرکز رہا
ہے اور آج بھی ہے، آرٹ، سائنس، فنونِ لطیفہ، سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات،
علوم غرض ہر شعبے میں لندن کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ بظاہر رنگینیوں اور رعنائیوں
سے محروم ہونے کے باوجود یہ ایک بھرپور اور مرعوب کُن شہر ہے۔ آبادی کی کثرت،
کے باوجود یہاں ہجوم اور افراتفری کا احساس نہیں ہوتا نہ ہی بدنظمی کا دور دورہ ہے۔
زندگی ایک خاص نظم وضبط کے تحت بسر کی جاتی ہے۔ لندن کی سڑکیں دُنیا کے جدید
شہروں کے مقابلے میں بہت تنگ ہیں بلکہ ہمارے کراچی اور لندن کی بیشتر سڑکیں لندن

کی سڑکوں سے زیادہ کُشادہ ہیں۔ لیکن بہتر ٹریفک کے اصولوں کی بناء پر لندن میں ٹریفک انتہائی ہموار اور سُبک رفتار ہے اور ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ مَیں نے کبھی ان سڑکوں پر بے ربطی اور ہڑبونگ کا عالم نہیں دیکھا۔

۱۹۷۰ء کا لندن (بلکہ سارا انگلستان) باقی یورپ کے مقابلے میں بے حد ارزاں تھا۔ یورپ کی خاک چھاننے کے بعد جب ہم نے لندن کی انواع و اقسام کے مال و اسباب سے لبریز دوکانیں اور نسبتاً حد سے زیادہ سستی قیمتیں دیکھیں تو یوں لگا جیسے ساری دُنیا بے چارے انگریزوں کو لُوٹ رہی ہے۔ لندن ہمیشہ سے خریداری کا پسندیدہ مرکز اور خریداروں کی جنّت رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاپنگ کا جو لُطف لندن میں آتا ہے وہ کسی اور شہر میں کہاں۔ ہم نے اس سے پہلے روم، پیرس اور ڈین ہیگ کے بازار بھی دیکھے اور بعد میں دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی گئے مگر لندن کے بازاروں میں ہجوم اور خریداروں کی وارفتگی کا جیسا عالم کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں شاپنگ سینٹروں اور بازاروں میں ہر دم ہجوم رہتا ہے۔ فُٹ پاتھوں، دوکانوں اور سڑکوں پر خریداروں کے اژدہام اور کھوے سے کھوا چھلتا دیکھا تو ہم ششدر رہ گئے۔ لوگ بے تحاشہ اور بے اندازہ شاپنگ کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آج ان کی زندگی کا یا خریداری کا آخری دن ہے۔ پھر اس کے بعد یہ موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ دوکانوں میں اشیاء کی فراوانی اور تنوع بھی قابلِ دید ہے۔ اس زمانے میں لندن واقعی سارے یورپ سے زیادہ ارزاں تھا۔ کھانے پینے کے سامان اور ٹرانسپورٹ سے لے کر سامانِ تعیش تک ہر چیز بے حد سستی اور آسانی سے دستیاب تھی۔ اُن دنوں یورپ کے دوسرے ملکوں سے لوگ خریداری کے لیے لندن آیا کرتے تھے۔ دو تین دن قیام کرتے، سامان خریدتے، سیر و سیاحت کرتے اور چلے جاتے۔ اس کے باوجود یہ سودا انھیں سستا پڑتا تھا۔ ہماری ملاقات ایک نوبیاہتا جرمن جوڑے سے ہوئی۔ یہ میاں بیوی فرنیچر خریدنے کے لیے

لندن آتے ہوتے تھے۔

ہم نے پوچھا۔

"کیا جرمنی میں اچھا فرنیچر نہیں ملتا؟"

جواب ملا۔

"ملتا تو ہے مگر لندن میں ورائٹی زیادہ ہے اور قیمتیں بہت کم ہیں۔ ہم نے دو تین دن یہاں ہوٹل میں قیام کیا، سیر و تفریح کی۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ادا کیا، فرنیچر خریدا پھر بھی جرمنی کے مقابلے میں خرچ زیادہ نہیں ہُوا۔ اور ہنی مون ہمیں مفت میں پڑ گیا۔"

مگر پھر رفتہ رفتہ لندن کو بھی نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ خصوصاً یورپین کامن مارکیٹ میں شامل ہونے کے بعد انگلستان میں بھی اشیاء کی قیمتیں بڑھتے بڑھتے دوسرے ملکوں کے برابر ہو گئیں۔ آج کا لندن بھی "گرانی گرانی" چلاّ رہا ہے۔ ہم جیسے لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو ہر چیز کی مہنگائی دیکھ کر پُرانے زمانے یاد کر کے آہیں بھر کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں لندن میں ہوٹل بھی بہت سستے تھے۔ کئی سال تک ہم وہاں جاتے تو مختلف ہوٹلوں میں بھی قیام کرتے اور لُطف اُٹھاتے۔ اکثر تو ہم سوچا کرتے تھے کہ یہ انگریز ہوٹل والے اِس قدر کم پیسے وصول کرنے کے باوجود زندہ کیوں کر رہتے ہیں۔ ایک بار ہم اپنی فلم کی کہانی لکھنے کی غرض سے برمنگھم کے ایک پُرسکون ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے۔ یوں تو ہم بیگم کے ساتھ ایک دوست کے آرام دہ گھر میں مقیم تھے مگر ہمیں چند روز کے لیے خاموشی، سکون اور تنہائی کی ضرورت تھی۔ ہمارے دوست کئی دن برمنگھم کے نواح کی خاک چھانتے رہے آخر ایک دن خبر لائے کہ بی بی سی کے عقب میں ایک ہوٹل مل گیا ہے جو آپ کی خواہش کے عین مطابق ہے۔ ہوٹل دیکھنے گئے تو واقعی بہت خوبصورت اور پُرسکون تھا۔ تیس چالیس کمروں پر

مستقل بہت آرام دہ کمرے اور سروس بھی لاجواب۔ کسی قسم کا شوروغل دُور دُور
تک نہیں تھا۔ اس ہوٹل کو تین بہنیں چلاتی تھیں اور غالباً تینوں ہی غیر شادی شدہ
اور خوش شکل تھیں۔ گویا ایک اور اضافی خوبی! اس ہوٹل میں ایک رواج ہم
نے یہ دیکھا کہ شام کو لاؤنج میں ٹرالیوں میں چائے، کافی، جُوس، دودھ، اوولٹین
بسکٹ، پنیر وغیرہ بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ مہمان ٹیلی ویژن دیکھتے رہیں اور کھاتے
پیتے وقت گزاریں۔ لُطف یہ کہ اس کے عوض قیمت وصول نہیں کی جاتی تھی۔

ہم اس ہوٹل میں آٹھ دس دن مقیم رہے، رات کو دیر تک لکھتے رہتے۔
صبح دیر سے اُٹھے۔ تیار ہو کر باہر نکلے تو گیارہ بجے تھے۔ ہم دفتر میں نوٹس بورڈ
پڑھنے لگے جس پر لکھا تھا کہ ناشتے کا وقت ساڑھے نو بجے تک ہے۔ اتنے میں
تین میں سے ایک مالکہ مسکراتی ہوئی دفتر سے نکل کر آئیں اور پوچھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہے آپ کو؟"

ہم نے کہا۔

"ضرورت تو ہے مگر مِل نہیں سکے گی!"

بولیں:

"کیا چاہیئے؟"

ہم نے کہا۔

"ناشتہ، مگر۔۔۔"

کہنے لگیں:

"کوئی بات نہیں۔ آپ ڈائننگ ہال میں چلئے ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟"

ہم نے فوراً مکمل ناشتے کا آرڈر دے دیا اور انھوں نے تازہ بتازہ گرماگرم
ناشتہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیا، اور حیرت کی بات یہ کہ چہرے پر کوئی ناراضی

بھی نہیں۔ مُسکرا مُسکرا کر ہمیں دیکھتی رہیں۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر کمرے میں بند
ہو گئے۔ یہ کمرہ بہت آرام دہ تھا۔ باتھ روم میں سفید قالین بچھے ہوتے تھے۔ شیمپو،
صابن اور آفٹر شیو بھی موجود تھا۔

پانچ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے دیکھا تو ان تینوں بہنوں
میں سے ایک عدد بہن کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔
بولیں:

"آپ نے لنچ بھی نہیں کھایا۔ مَیں نے سوچا بھُوکے ہوں گے۔ چائے،
ٹوسٹ اور سینڈوچ لے آئی ہوں۔ پسند کریں گے؟"

ظاہر ہے ہم پسند کیوں نہ کرتے۔ چائے بے حد پُرلطف تھی۔ نو دس بجے تک ہم
پھر مصروف رہے اور پھر لاؤنج میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ اس بار تیسری بہن ہماری
خاطر داری کے لیے موجود تھیں۔ بولیں۔

"آپ شاید ڈرنک تو نہیں کرتے۔ آپ کے لیے اوولٹین بنا دوں؟"

ہم نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ہمارے قیام کے دوران میں یہی معمول رہا کہ ہم گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کمرے سے
نکلتے تو ایک بہن ہمارے لیے ناشتہ لگا دیتیں اور پانچ بجے بلا طلب کیے دستک
دے کر چائے اور لوازمات لے آتیں۔ رات کو دودھ، اوولٹین یا دودھ اور ہاٹ
چاکلیٹ سے خاطر کی جاتی۔ اس طرح آٹھ نو دن گزر گئے اور ہمارا کام ختم ہو گیا۔
بِل دینے گئے تو معلوم ہوا کہ روزانہ کرایہ چار پونڈ ہے (جو اُس زمانے میں پاکستانی
سو روپے بھی نہیں بنتے تھے) مگر ہمارے ساتھ خاص رعایت ہے۔ صرف ساڑھے
تین پونڈ روزانہ کے حساب سے وصول کیے جائیں گے۔ شام کی چائے اور سینڈوچ کے
عوض کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ رات کی خاطر تو سبھی کے لیے فری تھی۔ ہم نے بِل ادا

کیا۔ تینوں بہنیں مُسکراتی ہوئی کار تک آئیں ۔ ہماری بیوی سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں اور ہم سے درخواست کی کہ دوبارہ پھر آئیے گا۔ ہم بہت دیر تک اس خاطرداری کے نشے میں مدہوش رہے اور سوچتے رہے کہ شاید تینوں کی تینوں نے ہمیں پسند کرلیا ہے۔ ورنہ اس قدر خصوصی مراعات کیوں دی جاتیں ؟

شام کو ہم نے اپنے دوست سے کہا :

"بھائی۔ کیا بات ہے کہ انھوں نے ہم سے بلا طلب کیے اتنی رعایت کردی اور پھر ہمارے کہے بغیر ہر شام ہمیں چائے اور سینڈوچ بھی مفت میں خود ہی لاکر کھلاتی رہیں۔ سب سے حیرت کی بات یہ کہ گیارہ بارہ بجے بھی ہمیں مسکراتے ہوئے ناشتہ دے دیا کرتی تھیں حالانکہ اس معاملے میں بعض ہوٹلوں میں ہمارا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا مگر نو ساڑھے نو بجے کے بعد ناشتہ نہیں مل سکا۔ اب یہ بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے ؟ کہیں وہ ہم پر عاشق وغیرہ تو نہیں ہوگئیں ؟"

ہمارے دوست بہت زور سے ہنسے۔ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر بولے

"آفاقی صاحب ! دراصل بات یہ ہے کہ جب مَیں نے ان سے آپ کے لیے کمرے کی بات کی تھی تو انھیں بتایا تھا کہ مجھے اپنے رائٹر دوست کے لیے کمرہ چاہیئے۔ وہ بے حد نازک مزاج اور سکون پسند ہے۔ کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا :

"ہماری خوش قسمتی کہ ایک ادیب ہمارے ہوٹل میں رہنا پسند کرے گا"

چنانچہ یہ ساری مراعات اور ساری مہربانیاں اسی لیے تھیں۔

ہم سوچتے رہ گئے۔ کہاں برمنگھم کی وہ ہوٹل والیاں اور کہاں ہمارے ملک کے ہوٹل والے۔ یہاں تو اگر ہوٹل والوں کو ہوا بھی لگ جاتے کہ مہمان کا تعلق لکھنے لکھانے سے ہے تو وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔ شاید مغرب اور مشرق میں یہی بنیادی فرق ہے۔

دو سال بعد پھر لندن

پی آئی اے کا ہوائی جہاز لندن ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُتر رہا ہے۔ فلائٹ حسب معمول بہت اچھی سُبک اور آرام دہ رہی۔ پی آئی اے کے بارے میں ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ بعض اوقات یہ لوگ مسافروں کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ پروازوں میں تاخیر، بکنگ میں مشکلات، طرزِ عمل سے شکایت۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر پاکستان کی قومی ایئرلائن کی کارکردگی قابلِ فخر ہے۔

میں اِس بار قریب قریب دو سال بعد لندن آیا ہوں باہر پھوار پڑتی نظر آرہی ہے یہ موسم سرما انگلستان میں قیامت خیز گزرا ہے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے ۳۶ برسوں میں اتنی سردی، اتنی بارش، اتنی برف نہیں پڑی اور اِس بات کا ثبوت بعد میں بھی فراہم ہوگیا۔ مئی کی آمد آمد ہے اور سردی ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بعض علاقوں میں تو درجہ حرارت صفر سے بھی کم ہوگیا ہے۔ لندن میں بھی بعض راتیں انتہائی سرد گزریں۔ برف تو نہیں پڑی لیکن پانی کی سطح پر برف کی جھلی ضرور جم گئی۔ لیکن سردی ہو یا گرمی، برف باری ہو یا بارش، لندن کے ایئرپورٹ، خصوصاً ہیتھرو ایئرپورٹ یکساں طور پر مصروف رہتا ہے۔ ہیتھرو کو یورپ اور امریکہ کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ہر روز بے شمار مسافر لندن سے امریکہ اور یورپ کے مختلف مقامات کے لیے روانہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر وہ بدنظمی نفسانفسی اور ہجوم نظر

نہیں آتا جو یورپ کے دوسرے نسبتاً کم مصروف ہوائی اڈوں پر دیکھنے میں آتا ہے اعداد و شمار کے مطابق ہر ایک منٹ کے بعد اس ایئرپورٹ پر کوئی جہاز آتا یا یہاں سے روانہ ہوتا ہے۔ ہر روز ناشتے اور رات کے کھانے کے درمیان ایک لاکھ کے لگ بھگ مسافر ہیتھرو ایئرپورٹ کو اپنے قدموں سے رونق بخشتے ہیں۔ جو لوگ انھیں خوش آمدید کہنے آتے ہیں یا جو عملہ ایئرپورٹ پر کام کرتا ہے وہ ان کے علاوہ ہے۔ پچھلے سال جو لاکھوں مسافر ہیتھرو ایئرپورٹ پر آتے ان میں سے ۸۵ لاکھ لندن میں قیام کرنے والے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ۸۵ لاکھ سیّاحوں نے لندن میں قریب قریب ڈھائی ارب پونڈ خرچ کیے۔ یہ صرف وہ لوگ ہیں جو ہیتھرو ایئرپورٹ سے لندن آتے تھے۔ لندن کا دوسرا مصروف ایئرپورٹ گیٹ وک اس کے علاوہ ہے اور پھر دوسرے شہروں کے نواحی ایئرپورٹ بھی ہیں۔ ان کی مدد سے آپ لندن میں آنے والوں کی تعداد کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں (بحری جہازوں، کاروں سے آنے والے ان کے علاوہ ہیں) پچھلے سال ہیتھرو ایئرپورٹ پر مختلف بین الاقوامی ایئرلائنوں کے ذریعے ۲۳ کروڑ کے لگ بھگ مسافر آئے اور گیٹ وک کے ایئرپورٹ پر ایک کروڑ چالیس لاکھ مسافروں نے قدم رنجہ فرمایا اس اعتبار سے دیکھا جاتے تو دُنیا کا سب سے مصروف ترین ایئرپورٹ اور دُنیا کا چوتھا مصروف ترین ایئرپورٹ دونوں لندن ہی میں ہیں، ان دونوں ہوائی اڈوں پر کروڑوں مسافر ہر سال آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ پچھلے موسم گرما میں ایک ہفتے میں اوسطاً دو ہزار چار سو جہازوں نے لندن سے مختلف شہروں کے لیے پرواز کی۔ یورپ میں ایمسٹرڈم اور پیرس کے ایئرپورٹ کے منتظمین کو یہ فکر کھاتے جا رہی ہے کہ بڑھتے ہوئے مسافروں سے نپٹنے کے لیے کچھ اور بھی کرنا چاہیے اس سلسلے میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ لندن کیلئے ایک اور ایئرپورٹ تعمیر کیا جائے ورنہ ہیتھرو بہت زیادہ پُر ہجوم ہو جاتے گا۔

کسی بھی ملک کی اقتصادی صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے وہاں کے ایئر
پورٹ بہترین بیرومیٹر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب یورپ، انگلستان میں اقتصادی بدحالی کی
لہر آئی تھی تو ایئرپورٹ کی رونق پھیکی پڑ گئی تھی۔ لیکن جب اقتصادی اور معاشی حالات
سنبھلے تو اچانک ہیتھرو ایئرپورٹ کی مصروفیت بدرجہا بڑھ گئی۔ صرف پچھلے ایک سال
کے اندر لندن کے ہیتھرو پر ٹریفک میں دس گناہ اضافہ ہوا ہے۔

ہیتھرو پر درجنوں ایسے مسافر بھی آتے ہیں جن کی شخصیت مشکوک ہوتی ہے۔
اسمگلنگ کے علاوہ غیر قانونی طور پر یا جعلی دستاویزات کے ذریعہ انگلستان آنے
والوں کی بھی ایک بڑی تعداد اُن میں شامل ہوتی ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے
امیگریشن کا عملہ نہایت ہوشیاری لیکن بلند اخلاقی اور تہذیب سے کام لیتا ہے۔

جس روز ہم ہیتھرو پہنچے اسی فلائٹ سے ایک درمیانہ عمر کے صاحب بھی لندن
پہنچے تھے ان کا کہنا تھا کہ ان کی منگیتر لندن میں ہے اور وہ شادی کے لیے یہاں آئے
ہیں۔ دوسری طرف امیگریشن کا عملہ ان سے سوالات کر رہا تھا کہ کیا وہ واقعی منگیتر ہیں؟
اور اس سے پہلے بھی ان کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ
کنوارے ہیں مگر ان کی عمر چالیس سال سے زائد تھی۔ واللہ اعلم بالصواب، امیگریشن
کا عملہ یوں تو ساری دُنیا میں بہت ہوشیار ہوتا ہے لیکن لندن کے بارے میں یہ کہنا
غلط نہ ہوگا کہ یہ لوگ قیافہ شناسی میں ماہر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ جو بظاہر
مشکوک نظر آتے ہیں اور جن کے پاس مناسب کاغذات بھی نہیں ہوتے ذرا سی دیر میں
مطمئن ہونے کے بعد رخصت کر دیتے ہیں لیکن بعض معقول نظر آنے والے لوگ بھی ان
کی عقابی نظروں سے محفوظ نہیں رہتے۔ یہی حال کسٹم والوں کا ہے اگر آپ اس راستے
سے گزر رہے ہیں جہاں کسٹم نہیں ہوتا تو وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر کسی کے بارے
میں کھٹک جائیں تو اس کا سامان چیک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ لندن ایئرپورٹ سے

باہر نکلیں تو وہی پُرسکون اور خاموش ماحول ملے گا، لگتا ہی نہیں کہ یہ شہر لاکھوں کی آبادی
رکھتا ہے نہ ٹریفک کا ہجوم اور شور نہ بسوں اور ٹیکسیوں کی ماراماری۔ بڑے سکون سے
قطار میں کھڑی ہوئی ٹیکسیوں میں سے سب سے اگلی ٹیکسی میں سوار ہو جائیں اور اپنی
منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔ سڑکوں پر دیکھئے تو سوائے رش اور ہجوم کے اوقات
کے، ٹریفک خاموش اور روانی سے رواں دواں نظر آتا ہے حالانکہ لندن کی آبادی
۶۲ لاکھ ہے ہر روز اس سے زیادہ تعداد میں لوگ گرد و نواح سے بھی آتے ہیں اور
واپس جاتے ہیں۔

ایک دہائی پہلے جب انگلستان کی معیشت تباہ حال تھی لندن بھی اِس بدحالی کا شکار
ہو گیا۔ تجارت، صنعت و حرفت، کلچر ہر شعبے میں یہ دَور ایک انحطاط کا دَور تھا۔ دس سال
پہلے لوگ کہتے تھے کہ لندن زندگی سے محروم ہو رہا ہے مر رہا ہے، ہر طرف ویرانی اور بے رونقی
نظر آتی تھی، دوکانیں خریداروں کے ہجوم سے محروم، ہر طرف اُداسی کا دَور دورہ، شراب خانے،
کلب اور ریسٹورنٹ اُجڑے ہوئے، تاریخی عمارتوں کو دیکھئے تو میلی کچیلی لندن کی غربت اور
ویرانی میں اضافہ کرتی ہوتی۔ آرٹ اور کلچر کے شعبے میں بھی لندن پیچھے رہ گیا تھا فیشن کے
معاملے میں پیرس اور سب سے بڑھ کر نیویارک لندن پر بازی لے جا چکا تھا بلکہ لندن والوں
کو یہ احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا کہ لندن کی جگہ اب نیویارک فیشن، تہذیب و ثقافت اور
صنعت و تجارت کا مرکز بن گیا ہے دُنیا بھر کی تمام سرگرمیوں کا مرکز لندن سے ہٹ کر
نیویارک بن گیا تھا پُرانے انگریز بڑی حسرت سے اپنے اچھے دنوں کا تذکرہ کیا کرتے
تھے اور آہیں بھر کر کہتے۔

"آہ لندن بھی ہماری پسماندگی کا شکار ہو گیا ہے"۔

یہ صورت حال ۱۹۷۵ء تک قائم رہی۔

انگریزوں سے آپ چاہے کتنا اختلاف کریں یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ یہ قوم

ناقابلِ تسخیر ہے، نہ ہٹلر انھیں فتح کرسکا نہ نپولین اور تو اور دوسری جنگ عالمگیر کے بعد کی اقتصادی تباہی نے انگلستان کی کمر ہمّت نہ توڑی۔ جنگ کے بعد دوسرے ملکوں نے بھی سنبھالا لیا لیکن انگریزوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ نہ صرف وہ ایک تباہ کُن اور خونریز جنگ سے گُزرے تھے بلکہ انھیں ایک ایک کرکے اپنی نوآبادیوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ ایک وقت تھا جب سلطنت برطانیہ کی قلمرو میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا مگر جب برطانیہ کی قلمرو سمٹ کر انگلستان کے ساحلوں تک محدود رہ گئی تو اس سلطنت میں کئی کئی دن سورج طلوع نہیں ہوا کرتا تھا۔ جنگ جیتنے کے باوجود بربادی اور تباہی کا دور دورہ تھا۔ اوپر سے ستم یہ کہ نوآبادیوں کی لوٹ کھسوٹ سے جو دولت آتی تھی اس سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہو گئے۔ بے شمار انگریز ملک سے باہر تجارت، صنعت اور ملازمتوں کے سلسلے میں برسرِ روزگار تھے مگر اب وہ بے روزگار ہو گئے۔ مَیں نے پندرہ سولہ سال قبل خود کئی کمشنر اور اعلیٰ عہدے داروں کو لندن کی ٹیوب میں سفر کرتے ہُوتے دیکھا یا بازاروں میں عام آدمیوں کی طرح گھومتے پایا۔ اللہ اللہ ایک وقت تھا کہ جب یہ ہندوستان کے قادرِ مطلق تھے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کی زندگی اور موت کے مالک۔ لیکن تعریف کی بات یہ ہے کہ ان پسپائیوں اور محرومیوں نے اس قوم کا ذہنی توازن خراب نہیں کیا۔ انھوں نے عروج کے زمانے میں جس بلند نگاہی کا ثبوت دیا تھا۔ زوال کے دوران میں بھی اسی خندہ پیشانی اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ اِسی لیے کہتے ہیں کہ زندہ قومیں کبھی نہیں مرتیں۔

جی تو ذکر ہو رہا تھا لندن کا۔ ۱۹۷۵ء تک یہ ملک اور شہر زوال کا نوحہ خواں تھا لیکن انھوں نے ہمّت نہیں ہاری مسلسل کوشش اور جد وجہد میں مصروف رہے، ایجادیں کیں، محنت کی، منصوبے بناتے اور ان پر عمل کیا کام کیا۔ یہاں تک کہ انگلستان زوال کے دَور سے باہر نکل آیا۔ ۱۹۷۵ء کے بعد سے اس ملک نے جو ہمہ گیر ترقّی کی اس کا جیتا

جاگتا ثبوت آج کا لندن ہے۔ ۱۹۸۵ء کا لندن۔ لندن آج پھر تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ یہ پھر دُنیا بھر میں جدید فیشن کا مرکز بن گیا ہے اور نیویارک کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے نقشے پر لندن ایک نئے اندازہ سے اُبھرا ہے۔ یہاں کی موسیقی نے ایک بار پھر مغرب میں اپنے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ اسٹیج اور تھیٹر کی جو رونق نیویارک کے براڈوے پر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ آج پھر لندن کے ویسٹ اینڈ کی زینت ہے۔ ویسٹ اینڈ کے تھیٹر تماشائیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کامیاب اور خوبصورت ڈرامہ یہاں دکھایا جا رہا ہے اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے۔ کنگز روڈ کے کلب اور تھیٹر آج پھر زندگی کی حرارت سے معمور ہیں اور تو اور لندن کے ریسٹورنٹ اور ہوٹل بھی اس خوشحال انقلاب کی زد میں آ گئے ہیں۔ ریسٹورانوں میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ ہوٹلوں میں مہنگے داموں بھی کمرہ نہیں ملتا۔ نوادرات کے نیلام گھروں میں لاکھوں پونڈ کی بولی دینے والے لوگ ایک بار پھر نظر آنے لگے ہیں۔ پچھلے ہی دنوں "امریکہ کے پرندوں" کے بارے میں ایک نادر کتاب جس میں مصنّف نے اپنے ہاتھ سے واٹر کلر سے تصاویر بھی بنائی تھیں ایک سو سال کے بعد دس لاکھ پونڈ میں فروخت ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ بیش قیمت پینٹنگز بھی لاکھوں پونڈ میں بِک رہی ہیں اور خریدنے والوں کی کمی نہیں ہے یہ تو درست ہے کہ ابھی انگلستان اقتصادی مشکلات سے دوچار ہے اور بے روزگاری، غربت اور مسائل کا شکار بھی ہے لیکن کوئی کلام نہیں ہے کہ لندن آج ایک بار پھر یورپ کا دارالحکومت بن چکا ہے، یہ آج یورپ کا اعصابی مرکز ہے۔ ہر طرف گہما گہمی ترقّی اور پیش قدمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ تجارتی اور اقتصادی ترقّی کا اندازہ یوں لگائیے کہ اس وقت لندن سے ۱۸۰ ملکوں کے لیے براہِ راست ٹیلیکس سروس دستیاب ہے۔ اگرچہ امریکہ اندرونی طور پر ٹیلی فون کے نظام کے سلسلے میں دُنیا بھر میں سرفہرست ہے لیکن امریکہ کے بعد انگلستان دوسرا ملک ہے

جہاں دُنیا بھر میں سب سے زیادہ ٹیلی فون ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت
دُنیا بھر میں چھ سو ملین ٹیلی فون ہیں ان میں سے ۹۴ فیصد ٹیلی فون ڈائریکٹ ڈائلنگ
کے ذریعہ لندن سے منسلک ہیں مصنوعی سیاروں کی مدد سے لندن دُنیا کے ہر شہر سے
رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ ٹوکیو جو دُنیا بھر میں تجارت اور صنعت وحرفت کا بہت بڑا مرکز سمجھا
جاتا ہے وہ بھی دُنیا کے سب سے ملکوں کو ٹیلیکس اور ٹیلی فون کے پیغامات بھیجنے کے لیے
اپنے لندن کے مرکز کی مدد لیتا ہے کیونکہ یہ نسبتاً آسان اور ارزاں ہے۔ دُنیا بھر کی تمام قابلِ
ذکر اور بڑی کمپنیوں کے دفاتر اب لندن میں موجود ہیں یہاں تک کہ امریکہ کے بعض عظیم
تجارتی ادارے بھی اپنے صدر دفتر لندن منتقل کرنے کی متعلق سوچ رہے ہیں۔

لندن کی یہ کایا پلٹ انگریز قوم کی ثابت قدمی مستقل مزاجی نظم اور منصوبہ بندی کا
جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

لندن کے شب و روز

لیکن اب لندن کے شب و روز کچھ بدل سے گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب شام
کو پانچ بجے کے بعد شہر بھر میں کوئی دوکان کھلی ہوئی نہیں ملتی تھی۔ پانچ بجے اور دوکانداروں
نے شٹر بند کر دیئے۔ اور نو اور پرچون اور جنرل مرچنٹس کی دوکانیں بھی بند ہو جاتی
تھیں۔ اب اگر آپ کو کسی چیز کی اچانک ضرورت پڑ گئی تو مارے مارے پھرتے قسمت
ہی ہے جو کوئی چیز مل جائے اور پھر ویک اینڈ یعنی ہفتہ اتوار کو تو لندن کو سانپ سونگھ
جایا کرتا تھا۔ لگتا تھا شہر میں کرفیو لگ گیا ہے یا کوئی جنگ چھڑ گئی ہے، کیا مجال جو کوئی
بھی دوکان کھلی ہوئی مل جائے۔ سڑکوں پر رونق یوں ہی کم ہو جاتی تھی۔ جن لوگوں
کو شہر سے باہر ویک اینڈ گزارنے جانا ہوتا تھا وہ روانہ ہو جاتے تھے۔ باقی لوگ
آرام سے گھروں میں بیٹھے کام کاج کرتے یا پھر عیش کرتے ——— لندن سیاحوں
کی چہل پہل اور آمد و رفت ساری رات رہا کرتی تھی یا پھر سینما گھروں اور کلبوں وغیرہ
میں رونق نظر آتی تھی۔ لیکن عام طور پر شہر ویران ہو جایا کرتا تھا۔

مگر اب ایسا نہیں ہے۔ شہر کے اکثر علاقوں میں دوکانیں سات آٹھ بجے تک کھلی
رہتی ہیں۔ ریسٹورنٹ بھی رات گئے تک مصروف رہتے ہیں اور نو اور انگریزوں کی دوکانیں
بھی آپ کو رات تک کھلی ہوئی مل جائیں گی۔ ہفتہ اور اتوار کو بھی کم از کم ایک دن بعض
لوگ دوکانیں ضرور کھولتے ہیں۔ اِس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟ یہ دراصل ایشیائی لوگوں

کے قدموں کی برکت ہے۔ ہندوستانی، پاکستانی، چینی، کورین، فلپائن کے لوگ لندن
میں آتے تو انھیں پانچ بجے دوکان بند کرنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی
دوکانیں اور کاروبار دیر تک کھولنے شروع کر دیتے۔ انگریزوں نے پہلے تو ناک بھوں
چڑھائی مگر بزنس آخر بزنس ہے۔ چند سال کے بعد اب انگریز دوکاندار بھی اسی روش
پر گامزن ہوگئے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہے کہ ہفتہ اتوار کو بھی آپ لندن میں
اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ ایشیائیوں کے مقابلے میں اب انگریزوں نے
بھی یہی اصول اپنا لیا ہے۔ ایشیائیوں خصوصاً بھارت اور پاکستان والوں نے
لندن کے مزاج کو تبدیل کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

مثلاً ریسٹورنٹوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ لندن کے لوگ نہ تو ریسٹورنٹ جانے کے
شیدائی تھے اور نہ ہی انھیں باہر کا کھانا پسند آتا تھا، بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی
تھی جو ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے عادی تھے مگر اب لندن والوں کے کھانے پینے
کی عادتیں بھی بدل گئی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ لندن میں نت نئے ریسٹوران
کھلنے شروع ہوگئے، ایشیائی کھانوں کے لیے ہندوستانی اور پاکستانیوں نے ریسٹورنٹ
کھولے۔ یہاں پہلے تو بھارتی اور پاکستانی سیاح کھانے کے لیے آتے تھے مگر رفتہ رفتہ
دیسی کھانوں کا مزہ انگریزوں کو بھی پڑ گیا، اب یہ حالت ہے کہ پاکستانی اور ہندوستانی
ریسٹورانوں میں اکثریت انگریزوں کی نظر آتے گی اور مزے کی بات یہ ہے کہ آنکھوں
سے آنسو رواں ہیں، مرچوں کی تیزی کی وجہ سے سُوسُو کرتے جا رہے ہیں مگر کھانے
سے باز نہیں آتے۔ بعض ریسٹورانوں میں مرچیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ مجھ سے نہیں کھائی
گئیں، شکایت کرنے پر ویٹر نے بتایا کہ صاحب مرچیں تو بہت مناسب ہیں۔

"ارے بھائی۔ ہم سے تو کھائی نہیں جا رہی ہیں"

وہ مسکرایا۔

"صاحب حیرت کی بات ہے، انگریز لوگ تو کبھی شکایت نہیں کرتے۔"
یہ انگریز تو اس میدان میں بھی ہمیں شکست دینے پر تُلے ہوتے ہیں۔

لندن اب ریسٹورانوں سے بھرپور شہر ہے۔ شہر کے کسی گوشے میں چلے جائیے
ریسٹورانوں کی قطاریں نظر آئیں گی۔ اور لُطف یہ ہے کہ انگریزوں نے اب سبھی قسم
کے کھانوں کی سرپرستی شروع کر دی ہے۔ عربی کباب۔ ترکی کباب۔ پاکستانی شامی
کباب اور سیخ کباب۔ کوفتے اور پھر سب سے بڑھ کر پاکستانی ہندوستانی چٹ پٹے
کھانے۔ ان کے علاوہ ویسٹ انڈین ریسٹوران۔ چائنیز ریسٹوران۔ کورین ریسٹوران
اطالوی ریسٹوران۔ فرانسیسی ریسٹوران۔ یونانی ریسٹوران۔ جاپانی ریسٹوران غرضیکہ
ہر ملک کے کھانے ہر ملک کے ریسٹوران میں مل جاتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا کھانے
والوں کی اکثریت انگریزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب نت نئے ریسٹوران کھلنے شروع
ہوگئے تو انگریزوں کو بھی مزہ پڑ گیا۔ اب انگریز بھی ریسٹورانوں کی سرپرستی کرنے لگے ہیں،
رات گئے تک لندن کے ریسٹورانوں میں چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ انگریزوں کی
آمدورفت سے ریسٹوران والوں کو تو فائدہ ہوا ہی مگر کھانے والوں کو یہ نقصان ہوا کہ اب
ان ہوٹلوں کا معیار بلند ہو چکا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ کھانے کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔

یہی حال تھیٹر کا ہے۔ ۱۹۸۲ء تک لندن کے تھیٹر میں مندا تھا۔ بہت سے تھیٹروں
میں اندھیرا پڑا تھا۔ کبھی کبھار کوئی ڈرامہ ہو گیا اور بس۔ لیکن پچھلے تین سالوں میں
لندن کے تھیٹروں میں بھی زندگی لوٹ آئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام تھیٹر نہ صرف
مصروف ہوگئے ہیں بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا پلے دیکھا جاتے۔ تھیٹر
کا بزنس ایک بار پھر منافع بخش ہو گیا ہے اور خوب چل رہا ہے۔ یہی حال اوپیرا موسیقی
کے پروگراموں کا ہے۔ ویسٹ اینڈ کے تھیٹر ایک زمانہ میں میوزیکل ڈراموں کے لیے مشہور
تھے۔ بعد میں یہاں ویرانی ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک میوزیکل ڈرامے پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ

پونڈ لاگت آتی ہے اور آمدنی اتنی نہیں تھی ۔ مگر اب میوزیکل ڈرامے ایک بار پھر مقبول ہو رہے ہیں ۔ یہی حال کامیڈی اور سنجیدہ ڈراموں کا ہے ۔ ڈراموں کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اداکار جو اسٹیج سے مایوس ہو کر فلموں میں چلے گئے تھے اب دوبارہ تھیٹر کی طرف آ رہے ہیں ۔ دراصل تھیٹر کے اداکار کو جو مزا اسٹیج پر آتا ہے وہ فلم یا ٹیلی ویژن میں کہاں ؟ لندن بے شمار تھیٹروں کا شہر ہے ۔ اِتنے کہ گننے بیٹھیں تو تھک جائیں ۔ لندن والوں کی پہلی پسند تھیٹر ہی رہی ہے ۔ نہ جانے کیوں پچھلے چند سالوں میں اچھے ڈرامے پیش نہیں کیے جا سکے مگر اب اسٹیج پر نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے ۔

لاہور اور کراچی کی خراب، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کے ہم سب عادی ہیں اور شاید ہی آپ کو یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ لندن والوں کو بھی یہی شکایت ہے ۔ کار والوں کا کہنا ہے کہ ان سے جو بھاری ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں وہ سڑکوں کی اصلاح اور مرمت پر خرچ کیے جاتے ہیں ۔ لندن شہر میں کاروں کی تعداد ۲۶ لاکھ کے لگ بھگ ہے ۔ وہ کاریں جو گرد و نواح سے ہر روز آتی ہیں اور لندن کی سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں ان کی تعداد بھی ان سے کچھ کم نہیں ہے ۔ سڑکیں تنگ ہیں، کیونکہ یہ ایک قدیم شہر ہے اِس لیے بہت سے لوگ تو اپنی کاروں کو استعمال ہی نہیں کرتے ۔ ٹرین ۔ ٹیوب یا بسوں کے ذریعہ سفر کرتے ہیں ۔ کیونکہ ایک اندازے کے مطابق اگر کسی ایک دن سب لندن والے اپنی کاروں کو سڑکوں پر نکال لائیں تو سڑکوں پر کوئی ایک کار بھی حرکت نہیں کر سکے گی ۔ روڈ ٹیکس کا حساب یہ ہے کہ پچھلے سال ایکسائز ڈیوٹی ٹیکس اور پٹرول ٹیکس کی مد میں لندن کے کار مالکوں نے حکومت کو ایک ارب دو کروڑ پونڈ دیتے ہیں (پاکستانی روپے میں اس کا حساب خود لگا لیجیے) اندازہ ہے کہ لندن میں ہر کار کا مالک سال میں اوسطاً ۱۶۴ پونڈ حکومت کو ادا کرتا ہے ۔ مگر کار والوں کو شکایت ہے کہ اِس خطیر رقم میں سے صرف ۱۱۳ ملین پونڈ سڑکوں کی بہتری پر صرف کیے جاتے ہیں ۔ روڈ ٹیکس کے طور

پر لندن کا ہر کار والا ۴۲ پونڈ ۸۰ پینس دیتا ہے ۔ جس میں سے سڑکوں کی اصلاح پر صرف ایک پونڈ خرچ کیا جاتا ہے ۔ آخر باقی رقم کہاں چلی جاتی ہے ؟ یہ صورتِ حال اس لیے بھی قابلِ غور ہے کہ لندن میں کاروں کی تعداد میں ہر سال تین فیصد کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ اب کار والوں کو یہ خوشخبری سُنائی گئی ہے کہ سال رواں میں انھیں زیادہ روڈ ٹیکس ادا کرنا ہو گا ۔ کار والے یہ کہتے ہیں کہ صاحب لندن میں کار چلانا دشوار ہو گیا ہے اب حکومت کی طرف سے ان کی روک تھام کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے مگر حکومت کار والوں کو کار چلانے سے تو نہیں روک سکتی ۔ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو رہا ہے ۔ پھر وہ کاریں خریدیں گے ہی ۔ اور جب خریدیں گے تو چلائیں گے بھی ۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم کو مزید بہتر بنایا جائے تاکہ لوگ کاروں کو استعمال کرنے کے جھنجھٹ میں ہی نہ پڑیں لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ۔ لندن میں ٹرینوں ۔ ٹیوبوں اور بسوں ٹیکسیوں کی تعداد پہلے ہی حد سے زیادہ ہے ۔ تو پھر اس کا حل کیا ہے ؟ ہم اپنی روڈ پرابلم حل کرنے کے لیے لندن ٹرانسپورٹ سے ماہرین بلاتے رہے ہیں اب لندن والوں کو چاہیے کہ وہ قیمتی مشورے حاصل کرنے کے لیے ہمارے ماہرین کو بلائیں ۔ جس کے بعد نہ بانس رہے گا نہ بانسری ۔

لندن کی بلکہ لندن کے کار والوں کی سب سے بڑی مشکل کاروں کا ہجوم اور سڑکوں کا پتلا ہونا ہے ۔ صبح کے وقت اور شام کو لندن کی سڑکوں پر ٹریفک کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ پچھلے چند سالوں میں کاروں کی رفتار اور کم ہو گئی ہے، یوں سمجھیے کاریں رینگتی ہوئی چلتی ہیں ۔ صبح کے مقابلے میں شام کو ہجوم زیادہ ہوتا ہے ۔ لندن میں شام کے وقت کوئی بھی شخص اوسطاً ۱۱ء۸ فی میل کی رفتار سے زیادہ تیز کار چلا ہی نہیں سکتا ۔ بسوں کا حال اس سے بھی خراب ہے کیونکہ بسوں کو تو ہر اسٹاپ پر رُک کر مسافروں کو اُتارنا اور سوار کرنا بھی ہوتا ہے ۔ بسوں کے مسافروں کو ہمارے

ملک میں بھی بہت شکایتیں ہیں، خیر ہمارے ملک کے بس کے مسافروں کے عذاب کا تو دُنیا میں کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا مگر لندن میں بھی جن اوقات میں رَش ہوتا ہے بے چارے بس مسافر خاصی مشکل میں گرفتار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک سروے کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے گھر سے کسی دوسری جگہ جانا چاہتے تو اس کا ساٹھ فیصد وقت ضائع ہو گا، اس کا پانچواں حصہ بس اسٹینڈ میں انتظار میں کٹے گا اور باقی سفر طے کرنے میں۔ ٹیوب میں سفر کرنے والے البتہ مقابلتاً جلدی پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ بس سروس بہت اچھی ہے۔

بسوں اور کاروں والوں کو لندن میں ایک اور مشکل کا بھی سامنا ہے جس سے ہمارے ملک کے بس اور کار والے محفوظ ہیں۔ سڑکوں پر جن مقامات پر زیبرا کراسنگ کے نشان بنے ہوتے ہیں وہ دراصل کار اور بس ڈرائیور کے صبر کا امتحان ہیں۔ جیسے ہی کسی راہ گیر نے زیبرا کراسنگ پر قدم رکھا دونوں طرف سے آنے والے ٹریفک کے لیے لازمی ہے کہ وہ رُک جاتے۔ سڑک عبور کرنے والے اس معاملے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے۔ بڑے اطمینان سے ٹہلتے ہوتے سڑک عبور کرتے۔ بڑے بوڑھے تو خیر مجبور ہیں لیکن نوجوان اور صحت مند لوگ بھی بڑے اطمینان سے ٹہلتے ہوتے گزرتے ہیں۔ پھر ان کے کُتے ہیں، وہ بھی چہل قدمی کرتے ہوتے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر کُتے اپنے اندھے مالکوں کو سڑک عبور کراتے ہیں۔ کئی بار ہم نے اکیلے کُتے کو بھی سڑک پر سے بڑے اطمینان سے گزرتے ہوتے دیکھا۔ ہر قسم کے ٹریفک کے لیے لازمی ہے کہ جس وقت کوئی حیوان یا انسان (کُتا) زیبرا کراسنگ پر سے گزر رہا ہو تو رُک جاتیں اور اس وقت تک روانہ نہ ہوں جب تک عبور کرنے والا سڑک کے دوسرے کنارے پر نہ پہنچ جاتے۔ یہ نہیں کہ بے صبری میں جیسے ہی وہ درمیان میں پہنچے آپ کار دوڑا دیں۔ دراصل دنیا بھر میں ٹریفک کا اصول یہ ہے کہ پیدل چلنے

والے کا حق سب سے افضل ہے (ہمارے ملک کی تو بات ہی اور ہے جہاں پیدل چلنے والے کو کاروں، بسوں والے گنتے ہی نہیں) اس لیے جب کوئی راہ گیر سڑک عبور کر رہا ہو اور اسے کوئی سواری ذرا سا دھکا بھی مار دے تو اس کی سزا انتہائی سنگین ہے (اور مشکل کی بات یہ ہے کہ یہاں جو سزا مقرر ہے وہ ملتی بھی ضرور ہے، کوئی اس سے بچ نہیں سکتا) اور اگر کہیں راہ گیر کو زیادہ چوٹ آجاتے یا وہ اللہ کو پیارا ہو جاتے (جو میں نے ایک بار بھی نہیں سُنا) تو نہ صرف سواری استعمال کرنے والے کو انتہائی سنگین سزا دی جاتے گی بلکہ بھاری رقم معاوضے کے طور پر بھی ادا کی جاتے گی۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ملک کے لوگوں کی سمجھ میں شاید نہ آتے۔ اس لیے کہ ہمارے شہروں کی سڑکوں پر رات دن درجنوں بلکہ بعض اوقات سینکڑوں لوگ کاروں، بسوں اور ویگنوں کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان عورتیں کون ہیں جو اس بلائے ناگہانی سے محروم ہیں؟ اکثر تو ہلاک کرنے والا موقعہ سے بھاگ ہی جاتا ہے اور اگر کوئی شامت کا مارا پکڑا بھی جاتے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اسے کیا سزا ملی ہے (زیادہ سے زیادہ چھ ماہ یا ایک سال۔ اکثر تو یہ بھی نہیں۔ تو جہاں انسانی جانوں (خصوصاً پیدل چلنے والوں) کی زندگی کی اتنی کم اہمیت ہو، جتنی کیڑے مکوڑے کی بھی نہیں ہوتی وہاں انسانوں کے بنیادی حقوق کے بارے میں سوچنا اپنا دل جلانے کے سوا اور کیا ہے؟

ٹریفک کے قوانین پر یہاں جس طرح عمل ہوتا ہے۔ وہ بھی قابلِ دید اور قابلِ تعریف ہے۔ اگر کوئی کار کسی دوسری کار کو خراش بھی لگا دے تو یا تو وہ زبانی منہ مانگا فیصلہ کرے یا پھر انشورنس والے بھاری رقوم دلاتے ہیں۔ ابھی کل ہی ریورس کرتے ہوئے ہمارے دوست جاوید ملک نے اپنی کار کے دھکے سے ایک پارک کی ہوئی موٹر سائیکل گرادی۔ نقصان کچھ بھی نہیں ہوا۔ مگر انھوں نے انشورنس اور پولیس کے ڈر سے خوشامد کرکے بمشکل بیس پونڈ دے کر جان چھڑائی۔ اپنے ایک دوست کا لطیفہ شاید ہم نے

آپ کو نہیں سُنایا۔ انھوں نے ایک پُرانی پٹیچر قسم کی منی سائز کار چالیس پونڈ میں
خریدی (یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے) ایک بار گزرتے ہوئے ایک کار والے نے اس
پر نشان ڈال دیا۔ انشورنس نے انھیں ۸۲ پونڈ ہرجانہ دلایا۔ چند ہفتے بعد کسی اور نے
انھیں ٹکر مار دی۔ ٹکر معمولی تھی۔ مگر انھیں ۲۱۳ پونڈ معاوضہ ملا۔ پھر تو وہ اِس تاک میں رہتے
تھے کہ کوئی آکر ان کی کار کو ٹھوکا مارے تو وہ مزید رقم وصول کریں۔ ایک سال بعد انھوں
نے اپنی یہ لکی کار ۲۸۰ پونڈ میں فروخت کر دی۔ ذرا حساب لگائیے کہ اس سودے میں انھوں
نے کیا کمایا؟ مگر یہ سب اس لیے کہ ٹریفک کے قوانین پر عمل در آمد ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے
کہا کہ شکر کریں آپ انگلستان میں ہیں، پاکستان میں ہوتے تو اگر نئی کار کو بھی کوئی مار کر
برباد کر دیتا تو لڑائی جھگڑے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا اور اگر پولیس کچہری کے چکر میں پڑتے
تو مزید وقت برباد ہوتا اور پیسے جو خرچ ہوتے سو الگ۔

تیسری دُنیا کے ملکوں کو ترقی پذیر کہیے یا پسماندہ بات تو ایک ہی ہے۔ اِن پسماندہ
ملکوں میں ایک پسماندگی تو یہ ہے کہ یہ معاشی اور مالی طور پر مغرب کے مقابلے میں بہت
زیادہ پسماندہ ہیں۔ پھر تعلیمی اور سائنسی میدان میں بھی یہ مغرب سے بہت پیچھے ہیں۔ ٹیکنالوجی
کے میدان میں ان میں اور امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں "صدیوں" کا فاصلہ ہے۔ یہ سب
تو ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ معاشرتی اور سماجی اعتبار سے بھی یہ مغرب سے
بہت پیچھے رہے ہیں۔ ہماری اخلاقی خرابیوں پر جب کوئی نکتہ چینی کرتا ہے تو ہمارا آسان
جواب یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہم لوگ عرصہ دراز تک غلام اور محکوم رہے ہیں اس لیے یہ
خرابیاں ہم نے ورثے میں پائی ہیں۔ ہماری بے شمار اخلاقی، سماجی اور کاروباری خامیوں
کو غُربت اور معاشی پسماندگی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ کسی حد تک یہ دُرست بھی ہے۔ قابلِ غور
بات یہ ہے کہ غلامی کے دَور میں ہمارے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں آزاد ہونے
کے بعد اب ان میں بتدریج کمی ہونی چاہیے تھی لیکن عملی طور پر صورتِ حال اس کے

برعکس ہے۔ جب ہم غلام تھے اس وقت کے مقابلے میں آج ہمارے اندر خامیاں،
کمزوریاں اور کوتاہیاں کہیں زیادہ ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا
ہے۔ غُربت اور معاشی پسماندگی کا عذر بھی قابلِ قبول نہیں لگتا اِس لیے کہ آج تیسری
دُنیا کی اقوام معاشی اعتبار سے کہیں زیادہ بہتر اور مستحکم ہیں تو ان میں پہلے سے کہیں زیادہ
اخلاقی اور سماجی جرائم پیدا ہو گئے ہیں۔ جوں جوں ہماری خوش حالی میں اضافہ ہو رہا
ہے ہمارے لالچ اور خود غرضی میں بھی دن دُگنا رات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا یہ
مفروضہ بھی اب غلط ثابت ہو چکا ہے کہ معاشی بدحالی اخلاقی خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔

مغربی اقوام کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اب پہلے سے کہیں زیادہ "بیمار" ہیں
نفاذ قانون پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ لاقانونیت پہلے سے زیادہ ہو چکی ہے۔ روزمرّہ
کے نظم و ضبط میں خاصا انتشار ہے۔ امریکی اور یورپی سوسائٹی میں جرائم اور اخلاقی کمزوریاں
حد سے زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ نیویارک میں ایک بار دو گھنٹے بجلی غائب ہوئی تو وہ ادھم
مچا کہ ہمارے ہاں لوڈشیڈنگ کے پورے عرصے میں ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ انگلستان اور
انگریز کسی زمانے میں کردار اور قانون کا لحاظ کرنے کے سلسلے میں ضرب المثل تھے، وہاں کی
پولیس کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے، مگر اب کیا حال ہے؟ انگلستان کی پولیس جرائم سے چشم پوشی
کرتی ہے خصوصاً ایشیائی آبادی کے مسائل سے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ خود لندن شہر میں
ایشیائیوں کے گھر جلائے گئے۔ کئی خاندان جل کر مر گئے۔ لُوٹ مار اور تشدّد کے بے شمار واقعات
رُونما ہوتے مگر انگلستان کی مستعد پولیس آج تک کسی ایک کا بھی کھوج نہیں لگا سکی۔ برمنگھم
اور انگلستان کے دوسرے علاقوں میں ایشیائی باشندوں کے گھر بار اور دکانیں جلائی
جا رہی ہیں، لُوٹی جا رہی ہیں، جائیدادیں اور کاروبار برباد کیے جا رہے ہیں مگر پولیس
خاموش تماشائی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قانون پسند اور انصاف کے خوگر انگریز نے ان

تمام واقعات کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ بھی مسترد کر دیا ہے۔ محض پولیس کی تفتیش پر
انحصار کیا جا رہا ہے اور پولیس پر ایشیائی باشندے کھلم کھلا الزام عائد کر رہے ہیں
کہ یہ جان بوجھ کر مجرموں سے چشم پوشی کرتی ہے۔ پولیس میں دوسری کمزوریاں اور خرابیاں
بھی پیدا ہو چکی ہیں اگرچہ ہماری پولیس کے مقابلے میں یہ بہت کم ہیں۔ مگر رجحان بتدریج
انحطاط اور زوال پذیری کی طرف ہے۔

بجلی کی چوری، ریڈیو لائسنس اور ٹی وی لائسنس کے پیسے بچانا ہمارے ہاں تو معمول
میں داخل ہے۔ چند سال پہلے تک کسی انگریز کے بارے میں ایسا سوچنا بھی محال تھا۔ مگر
اب صورت حال یہ نہیں ہے۔ ٹی وی لائسنس فیس کی چوری ہی کو لے لیجئے ٹی وی لائسنس
کی چوری کرنے والوں کی تعداد اس وقت انگلستان میں سولہ لاکھ کے لگ بھگ ہے
یعنی ہر سال سولہ لاکھ گھروں کے باسی ٹی وی دیکھنے کے باوجود لائسنس فیس ادا نہیں
کرتے۔ یہ اعداد و شمار ہوم آفس نے جاری کیے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ جس تیزی سے
یہ وبا پھیل رہی ہے اس کے مطابق ۲۰۰۰ء تک انگلستان میں بھی ٹی وی لائسنس
فیس چوروں کی تعداد میں بیس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ یہ سب اس وقت ہو رہا ہے
جب کہ لائسنس فیس وصول کرنے والا محکمہ خاصا مستعد ہے۔ اب محکمہ نے یہ تجویز پیش
کی ہے کہ جن لوگوں نے ۱۹۸۲ء تک ٹی وی لائسنس فیس ادا نہیں کی ہے ان پر بھاری
جرمانے عائد کیے جائیں، کیونکہ لائسنس فیس بچانے والے سرکاری خزانے کو دس کروڑ پونڈ
سالانہ کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بی بی سی ٹیلی ویژن کی آمدنی کا انحصار بھی لائسنس فیس
ہی پر ہے۔ چنانچہ بی بی سی کو اس وقت تقریباً ساڑھے چھ کروڑ پونڈ کا نقصان ہو رہا
ہے اس کا اثر بی بی سی کے اخراجات پر پڑ رہا ہے۔ پچھلے دنوں بی بی سی کے اسٹاف
نے تنخواہیں اور معاوضے بڑھانے کے لیے جو ہڑتال کی تھی وہ بھی دیکھا جائے تو اسی
کا شاخسانہ قرار دی جا سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں جعلی اشیاء تیار کرنا ایک
پرانی شکایت ہے اور اب ہمارے ہاں یہ معمول میں داخل ہو چکی ہے۔ خیر ہم لوگ تو اس
بارے میں اتنے سنگدل اور بے حس ہو چکے ہیں کہ ادویات میں بھی ملاوٹ کرتے ہیں اور
جعلی ادویات تیار کر کے فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض جان بچانے والی ادویات بھی
جعلی ہوتی ہیں۔ ہسپتالوں میں سپلائی کیے جانے والے بے شمار انجکشن محض سادہ پانی
پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ بیماری محض ہانگ کانگ، بینکاک، بھارت اور پاکستان
تک محدود نہیں رہی، یورپی ملکوں میں بھی عام ہو گئی ہے۔ اور تو اور انگریز بھی اس
وبا کا شکار ہو چکا ہے۔ کوئی وقت تھا جب جاپانی جعلی اشیاء اور کھلونے بنانے کے
لیے بدنام تھے اب جاپانی مصنوعات کی نقلیں بھی بازار میں موجود ہیں اور جاپانی صنعت کار
اور حکومت شور مچا رہے ہیں کہ مصنوعات چوروں کا انسداد کیونکر ہو؟ کہئے چور کو
مور والا محاورہ آپ کو یاد آیا کہ نہیں؟ ایشیا اور مشرق بعید کی تو بات ہی کیا خود انگلستان
میں یہ وبا پھیل چکی ہے۔ ہر چیز کی نقل بازار میں دستیاب ہے۔ مصنوعات، گھڑیاں،
بجلی کا سامان، ریڈیو، ٹی وی، کیسٹ ریکارڈر ہی نہیں فیشن اور ڈیزائن بھی چوری ہو
رہے ہیں اور خوب دھڑلے سے۔ خوشبویات کی چوری، کچن کے آلات کی چوری،
ٹیکنیکل اشیاء کی چوری یہاں تک کہ کپڑوں کے ڈیزائنوں اور فیشنوں کی چوری۔
ایک اندازے کے مطابق ساری دنیا میں سالانہ ساٹھ بلین کا نقصان صنعت کاروں کو
پہنچایا جا رہا ہے۔

انگلستان میں کپڑوں کے ڈیزائن اور فیشن کی صنعت بہت بڑی صنعت سمجھی جاتی
ہے مگر چوری کرنے والے آئیڈیاز اور ڈیزائن اور فیشن بھی چرا رہے ہیں۔ انگلستان کی
ڈیزائن کونسل فریاد کر رہی ہے کہ "ڈیزائن بچاؤ کمیٹی" بنائیے اور اس مقصد کے لیے
موثر اسکیمیں نافذ کیجئے ورنہ فیشن اور ڈیزائن کی صنعتیں ٹھپ ہو کر رہ جائیں گی فیشن اور

ڈیزائن ایجاد کرنے والے لاکھوں کروڑوں پونڈ صرف کرکے نت نئے خیالات اور ایجادوں کو جنم دیتے ہیں۔ نقل کرنے والے ان کی ہو بہو نقل کرکے بازاروں میں پہنچا دیتے ہیں۔

پچھلے دنوں لندن میں ایک نمائش لگی جس کا نام تھا "مصنوعی اور نقلی اشیاء کی نمائش" اس نمائش میں نقلی اور مصنوعی اشیاء پیش کی گئی تھیں۔ خوشبو کی مصنوعات انگلستان اور فرانس میں کروڑوں، اربوں پونڈ کماتی ہیں۔ مگر اب چوروں نے ان کی سستی نقلیں بازار میں پہنچا دی ہیں۔ خوشبو کی صنعتوں کو جو نقصان ہو رہا ہے اس کا اندازہ کروڑوں میں ہے۔ اس کے بعد شراب کا نمبر آتا ہے۔ عمدہ شرابیں تیار کرنے والے رو رہے ہیں کہ چوروں نے ان کی ہو بہو نقل بنانی شروع کر دی ہیں۔ اکثر تو نام میں زیر زبر کا فرق پیدا کرکے استعمال کرنے والوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ کپڑوں کے ڈیزائنوں میں بھی یہی اندھیر ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ جان بچانے والی دوائیاں مصنوعی بنا کر فروخت کر دیتے ہیں مگر اب انگلستان جیسے ملک میں بھی یہ وبا پھیل چکی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ امریکہ میں مصنوعی دل اور پیس میکر کی نقلیں بنائی گئیں ہیں۔ اب بتائیے کہ دل کے مریض کہاں جائیں؟ لیکن دولت کا لالچ لوگوں کو اندھا بنا رہا ہے۔

امریکہ کے ذکر پر یاد آیا کہ پچھلے دنوں ایک انگریز کارٹونسٹ امریکہ کا دورہ کرکے آیا تو بے شمار کہانیاں اپنے ساتھ لایا۔ اب ذرا اس انگریز کارٹونسٹ کے تاثرات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے اور سر دُھنئے۔

مائیکل ہیتھ نے امریکہ میں پانچ ہفتے گزارنے کے بعد جو خلاصہ نکالا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ مائیکل ہیتھ نے لکھا ہے کہ جب وہ طیارے سے باہر نکلا تو جسے دیکھتے وہ یہی کہہ رہا تھا کہ جائیے اچھا دن گزاریئے۔ یہ سُن سُن کر بے چارے کارٹونسٹ کے کان پک گئے کیونکہ ہر چند منٹ کے بعد اسے یہی الفاظ سننے کو مل رہے تھے۔ یوں لگا جیسے یہ الفاظ کمپیوٹر میں ڈال دیتے گئے ہیں اور لوگوں کے کانوں میں انڈیلے جا رہے ہیں ریسٹورنٹ

اور اسنیک بار میں پہنچے تو وہ محض اُبلا ہوا انڈا کھانا چاہتے تھے مگر ویٹرس کا اصرار تھا کہ ذرا ان غذاؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ وہ غذائیں کیا تھیں اس بارے میں جاننا مشکل تھا کیونکہ عجیب و غریب ناموں سے تو کھانوں اور غذاؤں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کارٹونسٹ کہتا ہے کہ ہم امریکیوں کی ہر چیز کی نقل کرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں جب کہ ان امریکیوں نے وہائٹ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ایسا بٹن بھی لگا رکھا ہے جسے دباتے ہی ساری دُنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ امریکی انگلستان کو ایک بڑے سائز کا ڈزنی لینڈ سمجھتے ہیں۔ بھلا اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ امریکیوں کو دُبلا ہونے کے لیے ورزش کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی مصروفیات اور وقتِ مقررہ پر کام ختم کرنے کی کوشش ہی انھیں دُبلا کرنے کے لیے کافی ہے۔

اب ذرا امریکی عورتوں کے بارے میں مائیکل ہیتھ صاحب کی رائے سُنیئے۔

امریکی تو خیر دُنیا کے لیے خطرے کا باعث ہیں ہی مگر ان کی عورتیں اس سے بھی بڑا خطرہ ہیں۔ عورتیں خطرہ ہی نہیں دشمن ہیں۔ میں امریکی عورتوں کا معمّہ آج تک حل نہیں کر سکا۔ امریکی عورت عجیب و غریب شے ہے۔ وہ اپنے گھروں سے اور لباسوں سے باہر نکل چکی ہیں۔ پیسے کمانے کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بشانہ دوڑ رہی ہیں۔ بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ عظیم ترین کارپوریشنوں کی صدر بھی ہیں اور بڑے بڑے کاروبار چلانے کی دعویدار بھی لیکن ذرا سا بھی جذباتی صدمہ پہنچتا ہے تو چیخنے چلانے اور رونے لگتی ہیں۔ سب کچھ کرنے کے باوجود کُھرچ کر دیکھئے تو اندر سے عورت کی عورت۔ بھئی خوب ہیں یہ امریکی عورتیں بھی یعنی مردوں کے مقابلے کے لیے بھی ہر وقت تیار ہیں مگر خالص عورت ہونے کا حق بھی استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے وہ برتاؤ دیکھ کر ہوتی جو یہ عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں ایک عورت دوسری عورت کی شکل سے بیزار ہے۔

بظاہر وہ عورت سے عورت کی ہمدردی کا راگ الاپتی ہیں جو محض بناوٹ ہے۔ یہ ترکیب درصل مردوں کو پریشان کرنے کے لیے ہے، حالانکہ امریکی مرد امریکی عورتوں کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہیں۔

جرائم

جرائم تو لندن میں (اور انگلستان میں) پہلے بھی ہوا کرتے تھے اور خاصے گھمبیر قسم کے جرائم کیونکہ ترقی یافتہ قومیں کیونکہ سبھی کاموں میں ترقی یافتہ ہیں اس لیے جرائم کے معاملے میں بھی یہ ترقی پذیر اقوام سے بہت آگے ہیں۔ یہاں پولیس کے پاس جدید ترین آلات ہوتے ہیں۔ تحقیق اور تفتیش کے جدید ترین طریقے انھیں آتے ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے یہ جرائم کا منٹوں میں پتہ لگا سکتے ہیں۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی کافی مؤثر اور مستعد ہیں۔ اس کے باوجود یہاں یہ محاورہ عملی طور پر استعمال میں آتا ہے کہ مجرم قانون سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ہیں۔ انھوں نے چوری ڈاکے اور قتل کے ایسے ایسے حیران کن اور سائنٹفک طریقے اختیار کیے کہ پولیس اپنی تمام مہارت اور مستعدی اور ہوشیاری کے باوجود منہ دیکھتی رہ گئی لیکن پولیس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ مجرم جو طریقے استعمال کرتے ہیں پولیس ان کا کھوج لگا لیتی ہے۔ اور انھیں پکڑتی ہے لیکن مجرم پھر پولیس سے آگے نکل جاتے ہیں، چنانچہ بلی اور چوہے کا یہ کھیل نہ جانے کب سے یہاں پولیس اور مجرموں کے مابین کھیلا جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی مجرم پولیس سے زیادہ ہوشیار نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک دن ضرور پکڑا جاتا ہے، بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں اس لیے ہزاروں لاکھوں کی چوری اور ڈاکوؤں پر یہاں کے بڑے مجرم اپنا وقت اور دماغ ضائع نہیں کرتے، لاکھوں کروڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں روپے نہیں پونڈز اور

ڈالرز! اب حساب لگا لیجیے کہ ہماری کرنسی میں یہ کتنی رقم ہوگی؟

خیر بڑے مجرموں کی سرگرمیاں تو ہمیشہ سے جاری ہیں لیکن پہلے یہاں چھوٹے موٹے جرائم کی رفتار نسبتاً بہت کم تھی۔ اب پچھلے چند سالوں میں لندن کے چور بھی اٹھائی گیرا پن کرنے لگے ہیں، جہاں موقعہ ملا گھر میں گھس کر جو سامان بھی ہاتھ لگا اُڑا لیا، کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتے اور ٹی وی، وی سی آر اور دوسرا ایسا سامان اُٹھا کر چمپت ہو گئے، اگر نقدی ہاتھ لگ گئی تو وہ بھی لے گئے۔ زیور البتہ یہاں کی عورتیں نہیں استعمال کرتیں۔ (سوائے ایکٹرسوں وغیرہ کے) اس لیے چور بھی زیورات سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی جگہ انھیں نوادرات مل جاتے ہیں۔ نوادرات کی یہ قوم بہت دلدادہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قیمت سینکڑوں ہزاروں بلکہ بعض حالات میں لاکھوں پونڈ ہوتی ہے" پھر نادر اور اصل تصاویر (پینٹنگز) یہاں کے کھاتے پیتے لوگوں کی کمزوری ہے۔ اور چوروں کی بھی، لہٰذا قیمتی پینٹنگز کی چوری بھی عام ہے بلکہ پچھلے چند سالوں میں تو بہت عام ہو چکی ہے مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ لوگوں کا معیارِ زندگی گرا تو چوروں کا معیار بھی گر گیا۔ اب چھوٹی موٹی چوریاں اور اٹھائی گیری کے واقعات پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئے ہیں مثال کے طور پر!

میرے بھانجے کی نئی مرسڈیز گھر کے باہر پارک ہے۔ رات کو چور آ کر پچھلا ونڈ سکرین توڑتے ہیں اور قیمتی ریکارڈ پلیئر نکال کر لے جاتے ہیں۔ یہ حرکت چوروں نے دوسری بار کی ہے ایک بار پہلے بھی وہ ایک ریکارڈ پلیئر نکال کر لے جا چکے ہیں۔ کاروں میں قیمتی چیزیں اب محفوظ نہیں ہیں۔ آئے دن اس قسم کی چوریاں ہونے لگی ہیں۔

ایک پاکستانی کے گھر میں بارش کا پانی گھس آیا عمارت کی حالت خراب ہو گئی وہ کرائے کے فلیٹ میں چلے گئے، اور گھر میں مرمت شروع ہو گئی۔ ایک رات چور آئے اور تمام قیمتی قالین، برتن، فرج، ٹی وی اور وی سی آر لے گئے۔ اس قسم کی چوریاں

اب لندن میں عام ہوگئی ہیں۔ اِسی لیے کہتے ہیں کہ کسی وقت گھر خالی مت چھوڑو ورنہ چور ہاتھ صاف کر جائیں گے۔ مگر گھر خالی کیسے نہ چھوڑیں، کام نہ کریں تو گھر والے کھائیں کہاں سے؟

کاروں کی چوریوں سے ہم پاکستان میں پریشان ہیں مگر حوصلہ رکھیے لندن والے بھی کچھ کم پریشان نہیں ہیں۔ گزشتہ دو سال میں تو کاروں کی چوری ایک مصیبت بن گئی ہے۔ سینکڑوں کاریں ہر سال چوری ہوتی ہیں اور کاریں بھی نہایت قیمتی، رولز رائس، مرسڈیز وغیرہ اور وہ بھی جدید ترین ماڈل کی۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا کہنا ہے کہ اس سال اب تک پانچ سو کے لگ بھگ قیمتی اور نئی کاریں چوری ہو چکی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں لندن میں چوری ہونے والی کاروں کی تعداد چھ ہزار سے بھی بڑھ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے ملک میں کاروں کی چوری اس سے زیادہ ہوتی ہو۔ لیکن لندن میں کچھ عرصے پہلے اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ لوگ اپنی کاروں سے یوں محروم ہو جائیں گے۔ لندن والوں نے بھلا کب یہ سوچا تھا، اب یہاں اس سلسلے میں کھوج لگانے کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ محکمے نے فی الحال تو یہ سفارش کی ہے کہ بھائی اپنی اپنی کاروں کی خود حفاظت کریں۔ اس کے ساتھ ہی محکمے نے کاریں بنانے والی فیکٹریوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کار چوری کو روکنے کے لیے کاروں میں حفاظتی آلے لگائیں۔ بھلا بتائیے یہ بھلا کیا مشورہ ہوا؟ آلے تو پہلے بھی لوگ لگاتے ہیں۔ ایسے الارم بھی کاروں میں نصب ہوتے ہیں کہ کار کو ہاتھ لگاتے ہی الارم چیخنے چلانے لگتا ہے مگر میں نے عرض کیا ہے نا کہ چور محافظوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ وہ اِن الارموں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آرام سے کار کھولی اور اپنا کام کر گئے۔ اب سُنیئے! پچھلے چند دنوں میں کتنی قیمتی کاریں چوری ہوتی ہیں۔

۱۲ رولز رائس (ایک کی قیمت لاکھوں پونڈ ہوتی ہے اور معمولی آدمی تو اس کے

بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا) ۱۴ پورشنز، ۵۵ رینج روورز، ۹۸ مرسڈیز بینز اور ۲۰۰ سے زائد جیگوئرز اور بی ایم ڈبلیو کاریں۔

پولیس کہتی ہے کہ اگر چوروں میں قیمتی کاروں کا شوق کم نہیں ہوا تو اس سال کار چوری کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو جائے گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ قوم ریکارڈ قائم کرنے کی بہت زیادہ شوقین ہے۔ یہ چور ایک منٹ کے اندر نہایت اطمینان سے کار کا تالا کھول کر کار لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ مالک حیران ہیں کہ ان حضرات کو چوری سے روکنے کا بھی کوئی طریقہ ہونا چاہیئے نا، (اس وقت ایک رولز رائس کی قیمت پچاس ہزار پونڈ ہے) چند دنوں کے اندر ساٹھ رولز رائس کاریں غائب ہو چکی ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ چوری شدہ کاریں جاتی کہاں ہیں؟ ہمارے ہاں تو قبائلی علاقے موجود ہیں مگر انگریز کیا کرتے ہیں؟ یہ کاریں پڑوسی یورپین ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ چوری کا علم ہو چور صاحب بڑے مزے سے کار میں سوار ہو کر فرانس یا جرمنی کے لیے سرحد عبور کر لیتے ہیں۔ بہت سی کاریں جعلی کاغذات کی مدد سے ایکسپورٹ کر دی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں لندن میں ایک جاسوس امریکہ میں بنی ہوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کو فلم میں ایک کار نظر آئی۔ اس رولز رائس کی نمبر پلیٹ لندن کی تھی اس نے چیک کیا تو پتہ چلا کہ یہ کار چوری ہو چکی تھی۔ دیکھی آپ نے چور کی دیدہ دلیری، سراغرساں اس کار کو برآمد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا اس لیے کہ فلم کے آخر میں یہ کار ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکی تھی۔ پولیس کہتی ہے کہ کار خریدنے سے پہلے پوری چھان بین کریں۔ اور اس مقصد کے لیے ایک فون نمبر بھی مخصوص کر دیا گیا ہے مگر چور آخر چور ہیں، پولیس کے بھی کان کاٹتے ہیں۔ چوروں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ دفتر سے معلومات حاصل کرکے کسی بھی قیمتی کار کے جعلی کاغذات بنا لیتے ہیں۔ جب وہ یہ کار فروخت کرتے ہیں تو خریدار ان کاغذات پر شک نہیں کرسکتا۔ یہ نہیں کہ

پولیس بالکل بے بس ہے۔ پچھلے چند ہفتوں میں پولیس نے ۲۵ کار چور پکڑے بھی ہیں جنھوں نے اپنے جُرم کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ انگلستان والوں کی یہ ادا ہمیں بہت پسند ہے کہ بدقسمتی سے اگر کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے تو نوّے فیصد مجرم اپنے جُرم کا اقرار کر لیتے ہیں، شاید سچ بولنے کی عادت سے مجبور ہو کر۔ لندن کی کاریں بیرونی ملکوں ہی میں نہیں انگلستان کے دوسرے علاقوں میں بھی فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اور دوسرے ہی دن مقامی نمبر پلیٹ کے ساتھ سڑکوں پر دوڑنے لگتی ہیں۔ جعلی ڈرائیونگ لائسنس اور دوسرے کاغذات تیار کرنا چوروں کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور جعل سازی بھی ایسی کہ بالکل مکمل۔

مشکل یہ ہے کہ کار چور چوریاں کر رہے ہیں اور پولیس والے انھیں پکڑنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں مگر مصیبت کار والوں پر نازل ہوتی ہے۔ انشورنس کمپنیوں نے اپنے ریٹ بڑھا دیتے ہیں اور اب کاروں کی انشورنس پر (صرف قیمتی کاروں کی) انشورنس کمپنیاں ہر سال قریبًا پانچ سو ملین پونڈ (یعنی ایک ارب روپیہ کے لگ بھگ) زائد رقم وصول کر رہی ہیں۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ لندن کے چور محض قیمتی کاریں ہی نہیں چُراتے یہاں "سائیکل چور" بھی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ہر سال ہزاروں سائیکلیں چوری ہو چکی ہیں۔ یعنی لندن کے چوروں کی نظر میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، اِس معاملے میں وہ امیر غریب کی تمیز نہیں کرتے۔ اگر امیر لوگوں کی کاریں چُراتے ہیں تو غریب لوگوں کی سائیکلوں کو بھی نہیں بخشتے۔ پولیس نے سائیکل چوری روکنے کے لیے یہ بندوبست کیا کہ سائیکلوں پر ایک خاص نشان کندہ کر دیتے ہیں مگر اس کا فائدہ؟ ذرا سوچیے کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شریف شہری سائیکل پر سوار جا رہا ہے اور پولیس اس کو روک کر اس کی سائیکل چیک کرنا شروع کر دے؟ ہمارے

پاکستان میں تو یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا بھی ہے۔ لیکن انگلستان میں اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سائیکل چوری کا انسداد بھی مشکل ہے۔

چوری یوں بھی ہوتی ہے کہ ایک لارڈ کے گھر میں دو آدمی دو ٹرک لے کر گئے اور ملازموں کو بتایا کہ وہ قیمتی پینٹنگز کی صفائی کرنے آئے ہیں۔ ملازم انھیں کام پر لگا کر چلے گئے۔ شام کو صفائی کرنے والے واپس گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیش بہا اصلی پینٹنگز لے گئے ہیں اور ان کی جگہ جعلی پینٹنگز لگا گئے ہیں نقصان ... دس کروڑ پونڈ۔

پولیس اور جرائم

ایک زمانہ تھا کہ لندن کی پولیس ساری دُنیا میں مثالی پولیس سمجھی جاتی تھی۔ ہتھیار نام کی کوئی چیز لندن پولیس کے پاس نہیں ہوا کرتی تھی۔ خوش اخلاقی، بہتر کارکردگی اور عوام میں مقبولیت کے اعتبار سے لندن کے "بوبی" (پولیس کانسٹیبل) کو فوقیت حاصل تھی۔ شہروں میں جرائم کا نام و نشان تک نہ تھا یا نسبتاً بہت کم جرائم ہوا کرتے تھے۔ قاتلوں، ڈاکوؤں اور دوسرے مجرموں کا لندن پولیس کے نام ہی سے دم نکلتا تھا۔ "اسکاٹ لینڈ یارڈ" کا نام دُنیا بھر میں سراغرسانی اور جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں مثالی اور حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ دُنیا بھر میں سراغرسانوں کو تربیت دینے کے لیے "اسکاٹ لینڈ یارڈ" کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ کسی بھی ملک میں اگر کوئی عقدہ حل نہ ہوتا تو وہاں کی حکومت اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تعاون حاصل کیا کرتی تھی۔ خود پاکستان کی حکومت نے شہیدِ ملت لیاقت علی خاں کے قتل کی گتھی سلجھانے کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کی تھیں (یہ اور بات ہے کہ اس کی رپورٹ آج تک منظرِ عام پر نہیں آسکی) قصہ مختصر یہ کہ لندن کی پولیس قانون کے نفاذ اور جرائم کے انسداد اور تحقیقات کے سلسلے میں سارے زمانے میں مشہور تھی۔ لندن کے "بوبی" سے لوگ والہانہ پیار کرتے تھے۔ کرسمس کے دنوں میں سب سے زیادہ تحائف لندن کے پولیس والوں ہی کے حصے میں آیا کرتے تھے۔ انگلستان کے عوام کو اپنی پولیس پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ ان سے محبت کرتے

تھے۔ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کی ذہانت اور دیانت پر فخر کرتے تھے۔ لندن میں پولیس نے مجرموں سے جرائم کے اعتراف کے لیے کبھی تشدد یا "تھرڈ ڈگری" کے طریقوں کا سہارا نہیں لیا۔ انگلستان کے قانون کے مطابق ہر شخص کو اس وقت تک معصوم اور بے گناہ سمجھا جاتا ہے جب تک کہ اس کے مجرم اور گناہگار ہونے کا یقین اور ناقابلِ تردید ثبوت پولیس کے پاس نہ ہو۔ یہ تھی شہرت لندن پولیس کی اور یہ تھا اس مشہورِ زمانہ محکمے کا کردار، مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ جہاں انگریزوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقیِ معکوس کی ہے وہاں لندن (انگلستان) کی پولیس کی کارکردگی اور شہرت بھی خراب ہوگئی ہے۔ جرائم کی رفتار میں اضافے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو پولیس کی کارکردگی اور ذہانت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ اور اس کی معقول وجوہات بھی موجود ہیں۔ بارہا پولیس ضرورت پڑنے پر موقعۂ واردات پر نہیں پہنچ سکی۔ کئی بار جرائم کا سُراغ نہ مل سکا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو پولیس سے شکایات پیدا ہو چکی ہیں۔ انگلستان کے غیر سفید باشندے تو خاص طور پر پولیس کے رویے کے شاکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پولیس ان کے معاملے میں نسلی تعصب اور جانبداری سے کام لیتی ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کو بھی پولیس کے رویے اور کارکردگی سے شکایت ہے۔

خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ مگر اب تو لندن پولیس نے لُٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ عوام سے بدسلوکی اور بے گناہوں پر تشدد کی شکایات عام ہو چکی ہیں۔ پولیس والوں کی بددیانتی، بدعنوانی اور رشوت خوری کے واقعات بھی عام ہو چکے ہیں۔ اور بہت وضعدار اور ماضی پرست انگریز کھوئی ہوئی سلطنت پر ماتم کناں ہونے کے ساتھ ساتھ پولیس کے کشتۂ ستم کے شاکی بھی نظر آتے ہیں۔ جس دن میں لندن پہنچا اسی روز ایک انوکھا واقعہ رونما ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان میں تو پولیس والوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ عام لوگوں سے بدسلوکی اور اہانت آمیز سلوک کریں۔ لیکن انگلستان میں بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ حضور

کلجگ ہے کلجگ۔ ہمارے لندن میں ہوتے ہوتے پولیس والوں نے ایک بیلے ٹیچر کے گھر میں گھس کر اس کے ساتھ بدسلوکی کی۔ اسے برہنہ زبردستی پکڑ کر لے گئے اور ہتھکڑی لگا کر برہنگی کے عالم میں ہی سڑک پر گھسیٹتے ہوتے پولیس کی گاڑی تک لے گئے۔ یہ ظلم وستم مس لٹل وڈ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ جو بیلے اسکول میں رقص کی تربیت دیتی ہیں۔ ان کی عمر ۲۹ سال ہے۔ خوبرو ہیں اور آس پاس کے محلّے داروں میں ان کی عزّت بھی ہے۔ مگر اب ان کی ساری عزّت خاک میں مل چکی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ اپنے گھر میں غسل کر رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے جلدی جلدی تولیہ جسم پر لپٹا اور دروازہ کھولنے گئیں۔ دروازے پر دو پولیس والے موجود تھے۔ جنھوں نے بتایا کہ محلّے والوں نے شکایت کی ہے کہ مس لٹل وڈ کے گھر سے شراب کی خالی بوتلیں پڑوسیوں کے گھروں میں پھینکی گئی ہیں۔ مس لٹل وڈ نے اس الزام کی تردید کی اور پولیس افسر سے کہا کہ وہ باہر چلے جائیں تاکہ وہ لباس پہن لیں۔ مگر پولیس والوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب کہ پولیس نے عدالت کو بتایا کہ مس لٹل وڈ نے پولیس کے سپاہی کو تھپّڑ رسید کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انھیں بتایا گیا کہ وہ زیرِ حراست ہیں۔ پولیس والوں نے انھیں بازوؤں سے پکڑ کر خوب زور زور سے جھنجھوڑا جس کی وجہ سے ان کا تولیہ جسم سے گِر گیا اور وہ ننگی ہو گئیں۔ پولیس والوں کا دل پھر بھی نہ پسیجا۔ انھوں نے مس لٹل وڈ کو ہتھکڑی لگانے کی کوشش کی تو بقول اُن کے، "مَیں نے بھی جدّوجہد کی" لاتیں چلائیں اور ایک سپاہی کے کاٹ لیا"۔ مگر کہاں پولیس کے ہٹّے کٹّے سپاہی اور کہاں بیچاری نرم ونازک مس لٹل وُڈ، جلد ہی پولیس والوں نے بے قابو کر کے ان کو ہتھکڑی لگا دی اور برہنگی کی حالت میں انھیں گھسیٹ کر پولیس کی گاڑی تک لے گئے۔

پولیس والوں نے جج کو بتایا کہ حضور، ہم پڑوسیوں کی شکایت پر ان کے گھر پہنچے تو انھوں نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ایک سپاہی کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس نے ہاتھ پکڑا

تو اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ ہم نے بمشکل انھیں قابو کیا اور ہتھکڑی لگا دی کیوں کہ وہ ہسٹریائی کیفیت میں تھیں۔ شور مچا رہی تھیں۔ نوچ رہی تھیں اور لاتیں مار رہی تھیں یہ تسلیم کہ اس پکڑ دھکڑ میں ان کا تولیہ زمین پر گِر گیا۔ مگر قسم لے لیں جو ہم نے ان کا عریاں بدن دیکھا ہو۔ ہم تو بس انھیں پکڑ کر گاڑی میں بٹھانے کے قصوروار ہیں۔ مس لٹل وڈ نے عدالت کو روتے ہوتے بتایا کہ تھانے پہنچ کر بھی انھیں کپڑے وغیرہ پہننے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور اسی طرح حوالات میں ٹھونس دیا گیا۔ جج صاحب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ انھوں نے یہ سب سُننے کے بعد تحقیقات کا حکم دیا مگر ساتھ ہی یہ دھمکی دی کہ مس لٹل وڈ کو قانون کے پاسبانوں کی توہین کرنے کے جُرم میں تین ماہ قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ دوسرے دن بمشکل مس لٹل وڈ کے وکیل نے ان کی ضمانت کرائی، بھلا بتایئے۔ آپ انگلستان میں پولیس سے ایسی حرکت کی توقّع کر سکتے ہیں؟

مانچسٹر میں گزشتہ دنوں پولیس نے ایک چالیس سالہ شخص جیمز ڈیوی کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مخبری پر گرفتار کیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کو یہ شخص لندن کے ایک کے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے درکار تھا۔ دوسرے دن جیمز ڈیوی کی لاش پولیس اسٹیشن سے مردہ خانہ پہنچائی گئی۔ لوگوں نے چلاّنا شروع کر دیا کہ جیمز کو پولیس نے قتل کر دیا ہے۔ پولیس کا بیان ہے کہ انھوں نے جیمز ڈیوی کو گرفتار کر کے تھانے پہنچایا تو ڈیوی نے پولیس والوں کے ساتھ ہاتھا پائی شروع کر دی۔ ڈیوی کے بارے میں پولیس نے بتایا کہ یہ شخص ذہنی طور پر متوازن نہیں تھا۔ اور اس سے پہلے بھی مختلف جرائم میں تقریباً بیس سال جیل میں گزار چکا تھا۔ تھانے پہنچ کر ڈیوی کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اس نے اپنے اور پولیس والوں کے کپڑے پھاڑ دیتے۔ ٹھوکریں مار مار کر اپنے جوتے کی ایڑیاں توڑ دیں۔ پولیس والوں کو ناخنوں سے نوچا اور دھمکیاں دینے لگا کہ اگر کوئی اس کے نزدیک آیا تو وہ اس کو قتل کر دے گا۔ پولیس والوں نے اسے قابو میں کرنے کے لیے بہت کوشش

کی۔ ایک سپاہی نے اسے پکڑ کر قابو میں کرنے کے لیے اس کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلایا۔ پولیس والے نے بالکل زور نہیں لگایا مگر ڈیوی کا گلا اتنی زور سے دبا کہ اس کا سانس رُک گیا اور وہ زمین پر گِر گیا۔ اس کی جان بچانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بے سود۔ اس کے رشتہ داروں کا کہنا ہے کہ پولیس نے ڈیوی کو گلا دبا کر مار دیا۔ جبکہ پولیس کی صفائی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ پبلک میں اس واقعہ پر بہت لے دے ہوئی اور اب یہ مسئلہ ہوم سیکرٹری کے زیرِ غور ہے جو ہاؤس آف کامن میں وضاحت پیش کریں گے۔ گویا ہماری پولیس اور انگلستان کی پولیس میں اب اتنا فرق ضرور رہ گیا ہے کہ وہاں کی پولیس والوں کی طرف سے ہاؤس آف کامن میں وضاحت پیش کی جاتی ہے اور اگر قصوروار قرار پائیں تو انھیں سزا بھی دی جاتی ہے۔ جبکہ یہاں ...؟

انگلستان کی پولیس ساری دُنیا میں اِس لیے مشہور تھی کہ یہ لوگ بالکل نہتے ہوا کرتے تھے ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجرم بھی ان پر ہاتھ اُٹھاتے ہوتے ہچکچاتے تھے۔ اور اگر کسی نہتے پولیس والے کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا تھا تو ساری پبلک اس مظلوم کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ مگر بعد میں حالات بدل گئے اور لندن پولیس کو بھی ہتھیار رکھنے کی اجازت مل گئی۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو پتہ چلا کہ لندن پولیس کو ہتھیار رکھنا راس نہیں آیا۔ پے در پے کئی ایسے واقعات رونما ہوتے کہ پولیس کی گولیوں سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ جب ایسے واقعات زیادہ ہونے لگے تو اعلیٰ حکام نے اپنے پہلے فیصلے پر غور کیا اور نظرِ ثانی بھی کی۔ اب اسکاٹ لینڈ یارڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ لندن کے پولیس والوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ دی جاتے۔ کیونکہ حال ہی میں ایک شخص اسٹیفن والڈورف پولیس کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اب سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے کم کوئی پولیس والا ہتھیار رکھنے کا مجاز نہ ہوگا۔ اور یہ فیصلہ بھی کوئی اعلیٰ افسر ہی کرے گا کہ کس پولیس والے

کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جاتے۔ ہوا یہ کہ وڈ پولیس والے ایک مجرم کی تلاش میں نکلے تو ان کا واسطہ اسٹیفن سے پڑ گیا ہے اور نتیجے میں وہ پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔ ہمارا ملک ہوتا تو پولیس والے اس کیس کو پولیس مقابلے کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ مگر انگلستان پھر انگلستان ہے۔ ابھی یہ ملک اتنا گیا گزرا نہیں ہوا کہ اپنی تمام روایات کو یکدم اور یکسر بالائے طاق رکھ دے۔ معاملے کی تحقیقات ہوئی اور اعلیٰ حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ پولیس نے بلاضرورت فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں اسٹیفن ہلاک ہو گیا۔ اِس سے پہلے بھی پولیس فائرنگ کے چند واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان واقعات کی روشنی میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ پولیس کے سپاہیوں اور نچلی سطح کے افراد کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ دی جاتے تاکہ بلاضرورت ہتھیار استعمال نہ کریں۔ گویا رفتہ رفتہ لندن پولیس دوبارہ اپنی پرانی روایات کو اپنا رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ خوبی سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قوم روایت پرست ہے اور کتنی ہی بے انصافی کیوں نہ کرے پھر بھی "انصاف پسندی" کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ ترقّی یافتہ مغربی ممالک میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں پولیس کے ہتھیاروں کے استعمال کرنے پر پابندیاں ہیں۔ اور پولیس کے ہاتھوں ہلاک والوں کی تعداد دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

چور اور سپاہی

مغربی فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں آپ نے پولیس والوں کو مجرموں کے تعاقب میں اندھا دھند کاریں دوڑاتے اور آپس میں کاریں ٹکراتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ یہ محض فلمی منظر نہیں ہے۔ مغربی فلموں کے دوسرے مناظر کی طرح یہ بھی درحقیقت وہاں کی روزمرّہ زندگی کا ایک عکس ہی ہوتا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں تو پولیس کی کاریں مجرموں کے پیچھے نہ صرف برق رفتاری سے دوڑتی ہیں بلکہ پولیس والے بے دریغ فائرنگ بھی کرتے ہیں۔ اور مجرم ان پر جوابی فائرنگ کرتے ہیں۔ اس کار ریسنگ اور فائرنگ کے نتیجے میں بہت سے پولیس والے، مجرم اور بے گناہ شہری ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن انگلستان میں معاملہ قدرے مختلف ہے۔ یہاں پولیس والوں کو عموماً اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں اس لیے فائرنگ کے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے۔ لیکن کاروں کے تعاقب کا منظر انگلستان میں بھی اکثر دیکھا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے گناہ شہری، مجرم اور پولیس والے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً صرف لندن میں گزشتہ چند سالوں کے اندر تیس سے زیادہ افراد "چور اور سپاہی" کی اس بھاگ دوڑ میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ بے شمار زخمی ہونے والے ان کے علاوہ ہیں۔ جس وقت عام شہری پولیس کی کاروں کو کسی دوسری کار کے تعاقب میں نہایت تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اپنی جان بچانے کی فکر کرتے ہیں۔ راہ گیر تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ کاروں

والے سڑکوں کے کنارے پر کاریں روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں کتنے بے گناہ لوگ حادثوں کا شکار ہوں گے۔

پولیس والے آخر کس قسم کے مجرموں کا تعاقب کرتے ہیں؟ انگلستان میں یہ تعاقب ان کاروں کا ہوتا ہے جن کے بارے میں پولیس کو شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ چرائی گئی ہیں۔ جب کوئی کار ڈرائیور پولیس کے اشارے پر رُکنے کی بجائے اور زیادہ تیز رفتاری سے بھاگنے کا ارادہ کرے تو پولیس سمجھ جاتی ہے کہ یہ کار چوری کی ہے یا پھر کار ڈرائیور شراب کے نشے میں مدہوش ہے یا پھر اسی قسم کی غیر قانونی یا غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ بس پھر کیا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ پولیس اور کار ڈرائیور کے مابین اندھا دھند ریس کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس بھاگ دوڑ کا انجام بسا اوقات حادثوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ پولیس کی کار مجرم کی کار سے ٹکرا جاتی ہے یا پولیس یا مجرم کی کار کسی اور کار یا دکان وغیرہ سے ٹکرا جاتی ہے۔ معجزاتی طور پر پولیس والے عام طور پر ان حادثات میں ہلاک یا زخمی ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ ان کی مہارت ہوتی ہو۔ اب ذرا تصوّر میں یہ منظر لائیے کہ آپ بڑے آرام سے اپنی کار میں چلے جا رہے ہیں کہ اچانک ایک کار اندھا دھند دوڑتی ہوئی آپ کی کار سے آگے نکل جاتی ہے۔ وہ ٹریفک لائٹس کی پروا کرتی ہے اور نہ دوسرے قوانین کی۔ ابھی آپ سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ سائرن کی آواز کے ساتھ ہی پولیس کی ایک کار یا متعدد کاریں نمودار ہوتی ہیں اور وہ بھی دیوانہ وار کسی ٹریفک ضابطے کا خیال کیے بغیر انتہائی تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ اس "تعاقب" کے خلاف انگلستان میں اب رائے عامہ کو بیدار کیا جا رہا ہے اور شہریوں کا کہنا ہے کہ کار چوری جیسے معمولی جُرم کے شبہ میں راستوں پر سینکڑوں معصوم شہریوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دینا کہاں

کی عقل مندی ہے؟ پولیس جن افراد کی کاروں کا تعاقب کرتی ہے اور وہ حادثہ کی صورت میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اب ان کے عزیزوں اور رشتے داروں نے بھی احتجاجی مہم شروع کردی ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی کار کو مشتبہ سمجھنے کی صورت میں روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اپنی رفتار اور زیادہ تیز کرکے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ محض کار چور ہی نہیں ہے اور بہت سے سنگین جرائم میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ایسے لوگوں کے تعاقب میں خود اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتی ہے۔ پولیس فیڈریشن کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ جس وقت کاروں کی بھاگ دوڑ کا یہ ڈرامہ شروع ہوتا ہے اکثر پولیس والوں کو بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ جس کا تعاقب کر رہے ہیں وہ کوئی مجرم ہے؟ اسمگلر ہے؟ پیشہ ور کار چور ہے؟ یا مدہوش ڈرائیور ہے؟ کیا پتہ کہ وہ کوئی قتل کرکے بھاگا ہو یا ڈکیتی یا اغوا اور آبرو ریزی کے جرم کا مرتکب ہوا ہو؟ پولیس فیڈریشن کا کہنا ہے کہ پولیس والوں کو اس بات کا الزام دینا افسوسناک ہے کیونکہ جس وقت کوئی ڈرائیور قانون شکنی کرکے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پولیس والوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اسے نظر انداز کر دیں۔

نیویارک اور جرمنی میں جس وقت پولیس کاریں کسی کار کے تعاقب میں روانہ ہوتی ہیں تو پولیس ہیڈکوارٹر سے ہر وقت رابطہ قائم رکھا جاتا ہے اور اگر معاملہ خطرناک ہو جاتے تو ہیڈکوارٹر کی طرف سے تعاقب ختم کرنے کی ہدایت کر دی جاتی ہے۔ لیکن لندن میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہاں بھی پولیس والوں کے لیے اس سلسلے میں ضروری ہدایات موجود ہیں لندن کے پولیس حکام کا کہنا ہے کہ تیز رفتاری سے تعاقب کرنے والے پولیس افسر بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتے اور ان کے خلاف بھی ٹریفک قانون توڑنے یا پبلک کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے الزام میں مقدمات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ محکمۂ داخلہ کی ہدایات

کے مطابق کوئی بھی ایمرجنسی یا جرم اتنا سنگین نہیں ہے کہ لوگوں کی طرف سے پولیس کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا گیا ہو۔ مگر مستقبل قریب میں "پولیس کار چیزنگ" کے خلاف مثبت اور ٹھوس کارروائیوں کی توقع کی جا رہی ہے۔

پولیس کی تحقیقات اور تفتیش کے سلسلے میں یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ پولیس والے بھیس بدل کر مجرموں کا سراغ لگاتے ہیں۔ لیکن لندن کے سراغرسانوں نے غیر قانونی قماربازی کا سراغ لگانے کے سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا اس کے نتیجے میں ان پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ ہوا یہ کہ چار سراغرسانوں کے سپرد یہ فرض کیا گیا کہ وہ ایک شراب خانے میں واقع قمار خانہ کا پتہ لگائیں۔ یہ چاروں حضرات شراب خانے میں پہنچے اور مسلسل چار دن تک وہاں جاتے رہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے وہاں شراب نوشی کی بلکہ جوا بھی کھیلا اور سرکاری خزانے سے ایک سو چالیس پونڈ کی رقم جوتے میں ہار گئے۔ پولیس کے چیف سپرنٹنڈنٹ کا کہنا ہے کہ شراب اور جوتے پر جو رقم صرف ہوتی وہ حق بجانب ہے لیکن مجسٹریٹ کا خیال کچھ اور ہے۔ ایک مجسٹریٹ مسٹر مارک رومر نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ غیر مناسب طریقۂ تفتیش ہے۔ لیکن پولیس سراغ رساں سرکاری ڈیوٹی پر تھے اس لیے انھیں پچاس پونڈ رقم کی رعایت ملنی چاہیے کیونکہ انھوں نے اپنے اعلیٰ حاکم کی نگرانی میں یہ کارروائی کی تھی جسے خلافِ قانون نہیں کہا جا سکتا۔ اس سراغرسانی کے نتیجے میں پولیس دو قمار بازوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب بھی ہوگئی۔ مگر عام تاثر یہ ہے کہ پولیس والے بہت اناڑی قمار باز ہیں۔ ایک صحافی نے مشورہ دیا ہے کہ اگر پولیس والوں کو جوا کھیل کر ہی جواریوں کو پکڑنا ہے تو پولیس کے محکمے کو چاہیے کہ پہلے انھیں ڈھنگ سے جوا کھیلنے کی تربیت تو دے۔ گویا لندن پولیس کو اب قماربازی کی کلاسیں بھی شروع کرنی ہوں گی۔

ایک طرف تو پولیس کار چوروں اور قمار بازوں کا قلع قمع کرنے کے سلسلے میں اتنی مستعد

ہے۔ دوسری طرف عام تاثر یہ ہے کہ لندن جیسے مرکزی شہر میں جرائم کی رفتار میں اضافہ ہوگیا ہے۔ خاص طور پر تشدد کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ امریکہ کے بعض شہروں میں تو دن ڈھلنے کے بعد لوگوں کا سڑکوں پر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ انگلستان میں پہلے یہ صورت حال نہیں تھی۔ لیکن اب ایک جائزے میں بتایا گیا ہے کہ لندن کی سڑکیں بھی شہروں، خصوصاً معمّر لوگوں کے لیے غیر محفوظ ہوگئی ہیں۔ مثلاً تین میں سے دو بڑی عمر کے لوگ اندھیرا پھیلنے کے بعد سڑکوں پر تنہا نکلتے ہوتے ڈرتے ہیں۔ اس کا سبب بڑھتی ہوتی بے روزگاری، غنڈہ گردی کا رجحان اور منشیات کو قرار دیا گیا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے پولیس کو گشتی سپاہیوں اور پولیس کاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیے۔

دوسری طرف پولیس کا کہنا ہے کہ صاحب بڑی عمر کے لوگوں کا تحفّظ بجا لیکن کچھ عرصے سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ بڑی عمر کے لوگ قانون کی زیادہ پاسداری نہیں کرتے حالانکہ ان سے توقّع کی جاتی ہے کہ نوجوانوں کے مقابلے میں وہ قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ لیکن اب بڑی عمر کے لوگ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزیوں میں سب سے پیش پیش ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ خواتین کار ڈرائیور بہت محتاط خیال کی جاتی تھیں مگر اب اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اب قوانین کی زیادہ تر خلاف ورزی خواتین ہی کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ۷۹ سالہ خاتون ڈرائیور کا مقدمہ ایک مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان خاتون نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کے تقریباً تمام اصول یکے بعد دیگرے توڑے ہیں۔ ایک بار انھیں ایک بڑی سڑک پر یک طرفہ ٹریفک کے قانون کی قانون کی خلاف ورزی پر ٹکٹ دیا گیا۔ اس کے بعد تیز رفتاری میں ان کے چالان کیے گئے۔ چند روز بعد ایک معروف سڑک پر ان کی کار پنکچر ہوگئی مگر وہ تین پہیّوں پر

ہی کار چلاتی رہیں اور آٹھ میل تک چلی گئیں۔ پہیّے کے شور سے محفوظ رہنے کی خاطر انھوں نے کار کا ریڈیو بہت بلند آوازمیں کھول دیا یہاں تک کہ وہ پولیس والوں کے سائرن کی آوازیں بھی نہیں سُن سکیں۔ جس وقت پولیس نے انھیں روکا وہ ۴۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تین پہیّوں کی کار دوڑا رہی تھیں۔ کئی دوسرے کار والے ان سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی کاریں فٹ پاتھ پر چڑھانے پر مجبور ہوگئے۔ بہت سے تو اتنے خوفزدہ ہوتے کہ کاروں کو سڑک پر ہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پولیس نے انھیں روکنے کی کوشش کی تو وہ ایک دن وے سڑک پر مخالف سمت سے داخل ہوگئیں اور انھوں نے کئی چھابڑی والوں کی دکانیں اُلٹ دیں۔ ان کا پنکچر شدہ ٹائر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر چکا تھا اور کار کے سامنے کا بمپر بھی غائب ہوگیا تھا۔ سامنے کے مڈگارڈ کے ٹکڑے اُڑ چکے تھے مگر وہ بےفکری سے ریڈیو پر نغمے سنتی ہوتی کار اڑاتے لیے جا رہی تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان محترمہ نے محض دو سال پہلے ہی ڈرائیونگ لائسنس حاصل کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے ان پر ساڑھے تین سو پونڈ جرمانہ کیا تو وہ بہت ناراض ہوئیں اور بولیں "کیسا زمانہ آگیا ہے، بزرگوں کا تو کوئی لحاظ نہیں کرتا"

❦

عربوں کے ٹھاٹ

لندن ٹائمز کے سنڈے میگزین کے سرورق پر ایک دوشیزہ کی رنگین تصویر شائع ہوئی ہے - میک اَپ سے چہرہ مزیّن، لباس ایسا کہ جسم کا بیشتر حصّہ نمایاں، گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا، ہونٹوں پر دل نواز مسکراہٹ اور ہاتھ میں ایک جام - ایک تو صاحبِ تصویر حسین اس پر لندن ٹائمز کی رنگین طباعت، ہر دیکھنے والے کی توجّہ اپنی طرف کھینچنے والی یہ جام بدست ماڈرن دوشیزہ کون ہیں؟ کوئی فلم یا ٹی وی کی اداکارہ، فیشن ماڈل، مغرب کی کوئی جدید ترین خاتون؟ جی نہیں خوش قسمتی یا بد قسمتی سے یہ ایک مسلمان عرب کی صاحبزادی ہیں اور عرب بھی کوئی گمنام اور ایسا ویسا نہیں - دُنیائے عرب کی مشہور شخصیت، اخباری کالموں کی مستقل زینت، کاروباری حلقوں کی ایک ممتاز ہستی، نام ان کا عدنان خشگی ہے، ایک سرکردہ عرب تاجر اور ٹھیکے دار ہیں، کہتے ہیں کہ عدنان خشگی اس وقت دُنیا کا امیر ترین انسان ہے - ان کی اوسط آمدنی پانچ سو پونڈ فی منٹ ہے، ہفتوں مہینوں اور سالوں کی آمدنی کا حساب خود ہی لگالیں - ٹائمز کے سرورق پر شائع ہونے والی اِن ہی عدنان خشگی کی صاحبزادی نبیلہ کی ہے -

ظاہر ہے کہ نبیلہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہیں - ارب پتی تاجر کی لاڈلی بیٹی ہیں، شوق بھی امیروں والے ہیں - دُنیا بھر میں ان کی رہائش گاہیں بکھری ہوئی ہیں، ایک اشارے پر دُنیا جہاں کی آسائشیں ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں، انھیں کشتی رانی کا بھی شوق

ہے، چنانچہ ان کے والد نے انھیں ۲۰۰ فٹ لمبی پُرتعیش یاٹ خرید کردی ہے لیکن نبیلہ اس سے مطمئن نہیں ہے، اب انھوں نے چار سو فٹ طویل یاٹ بھی خریدی ہے جس پر ہیلی کاپٹرز بھی موجود رہتے ہیں۔ طلائی نقرئی ظروف، بیش قیمت فرنیچر اور نادر تصاویر سے آراستہ اِس یاٹ کے غسل خانے سنگِ مرمر کے ہیں جن میں قیمتی موتیوں کی سجاوٹ ہے، اس یاٹ کی حفاظت کے لیے میزائل شکن توپیں بھی نصب ہیں، گویا قسمت اس ۲۳ سالہ دوشیزہ پر پوری طرح مہربان ہے -

عیش و آرام اپنی جگہ سہی نبیلہ کا کہنا ہے کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تجارت ہے باپ نے انھیں کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا رُکن بھی بنا رکھا ہے - ان کا ایک محل فرانس کے ساحل پر بھی ہے جہاں خود ان کے بقول وہ محض لباس تبدیل کرنے کے لیے جاتی ہیں، جہاز رانی نبیلہ کا دوسرا دلچسپ مشغلہ ہے - بحری بیڑے میں ۲۹۶ ٹیلی فون لگے ہوتے ہیں جن میں ہیرے جڑے ہیں، نبیلہ کی عمر جس وقت پندرہ سال تھی اس وقت اس نے اپنے والد سے فرمائش کرکے بیس ملین پونڈ کا ہیرا خریدا تھا مگر نبیلہ کا کہنا ہے کہ اسے ہیروں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، دلچسپی نہ ہونے پر یہ عالم ہے اگر انھیں دلچسپی ہوتی تو کیا ہوتا ؟

خود عدنان خشگی کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے سفر میں رہتے ہیں دُنیا بھر کی خاک چھانتے ہیں مگر اپنی بیٹی سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ قائم رکھتے ہیں، بقول نبیلہ کے ان کے والدین ہی نبیلہ کے بہترین دوست ہیں - اب نبیلہ کو کاروں کی ریس کا بھی شوق ہوگیا ہے اور وہ آئندہ سال فرانس کی مشہور کار ریس میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں - ایک بار نبیلہ کو خدمتِ خلق کا شوق چُرایا تو انھوں نے کلکتہ میں نرس شرسیا کے کیمپ میں جاکر رہنے کا ارادہ کیا مگر بعد میں بدل دیا - فی الحال انھیں اپنی شادی کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ہے مگر ان کے والد کی شادی

بذاتِ خود دنیا بھر کے اخباروں کی صفِ اوّل کی خبر ہوتی ہے۔ نبیلہ کی والدہ ثریا خشّگی کے بارے میں کون نہیں جانتا، انھوں نے طلاق کے بعد عدنان خشّگی سے ایک ہزار ملین پونڈ اخراجات وصول کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

نبیلہ لبنان میں پیدا ہوئی تھیں، اگرچہ ان کا وطن سعودی عرب ہے مگر ان کی پرورش لبنان اور پھر یورپ میں انگریز گورنس کی نگرانی میں ہوئی۔ تعلیم انھوں نے انگلستان میں حاصل کی۔ بقول ان کے ان کے والد خود مغرب زدہ ہیں اِس لیے وہ خود بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ کرسمس اور نیا سال وہ ہمیشہ اپنی والدہ کے ساتھ مناتی ہیں جو اَب ان کے والد سے طلاق حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے باپ نے (جنھیں وہ بابا کہتی ہیں) مجھے یہ سکھایا ہے کہ مسلمان ہونا دُنیا کی اہم ترین چیز ہے مگر نبیلہ سعودی عرب ہونے کے باوجود کبھی سعودی عرب میں نہیں رہیں ظاہر ہے ان کا گزارہ مغرب ہی میں ہو سکتا ہے۔

نبیلہ عدنان خشّگی واحد عرب نہیں ہیں جن پر دولت اور قسمت کی دیوی مہربان ہے ایسے عربوں کی تعداد اب ہزاروں لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے جو خدا کے فضل سے دولت میں کھیل رہے ہیں، ان کی دولت مندی، خوشحالی اور فضول خرچی کی داستانوں نے اب ابتدائی عہد کے امریکی ارب پتیوں کی جگہ لے لی ہے۔ اِسی قسم کے ایک خوش نصیب تاجر مہدی التجار بھی ہیں موصوف کا تعلق متحدہ عرب امارات سے ہے۔ ارب پتیوں اور کھرب پتیوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ انگلستان میں اپنے ملک کے سفیر بھی رہ چکے ہیں مگر ان کا زیادہ وقت انگلستان سے باہر گزرتا ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن سے برطانوی محکمہ خارجہ عاجز تھا، وزیر تو وزیر انھوں نے ایک بار انگلستان کی ملکہ کو بھی انتظار کرا دیا تھا، ملکہ کے کئی دعوت ناموں کی رسید دینا بھی وہ گوارا نہیں کرتے تھے، جب انھوں نے سفارت سے استعفیٰ دیا تو رسمی طور پر بکنگھم پیلس جا کر ملکہ سے ملاقات کرنے کی زحمت بھی

گوارا نہیں کی، وزارت خارجہ نے بہت ناک بھوں چڑھائی اور مہدی التجار مستعفی ہو کر واپس چلے گئے، اب دوبئی کے حکمران شیخ رشید کا اصرار پر وہ دوبارہ انگلینڈ میں سفارت کا عہدہ سنبھالنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور لُطف کی بات یہ ہے کہ تمام گزشتہ تلخ تجربات کے باوجود برطانوی وزارتِ خارجہ نے ان کی سفارت کی منظوری دے دی ہے۔ لیکن وزارت خارجہ نے یہ شرائط عائد کر دی ہے کہ وہ سفیر کے طور پر اپنے ذاتی کاروبار کو فروغ نہیں دیں گے اور سفارتی آداب کی پابندی کریں گے۔ مہدی التجار کا کاروبار ساری دُنیا کے علاوہ انگلستان میں بھی پھیلا ہوا ہے، لندن کا مشہور زمانہ سٹور "ہیررڈز" ان کے بھائی کی ملکیت ہے، ان کی سفارت کے زمانے میں ان کے خلاف مختلف عدالتوں میں اختلافات کے سلسلے میں کروڑوں پونڈ کے مقدمات درج کرائے گئے تھے مگر انھیں سفارتی مراعات کا سہارا حاصل تھا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں وہی معاملہ مہدی صاحب کے ساتھ بھی ہے۔ مہدی صاحب اگرچہ برطانیہ میں متحدہ عمارات کے سفیر ہیں مگر ان کا زیادہ وقت دوبئی میں گزرتا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فلسطینیوں کا ایک گروپ ان کے خون کا پیاسا ہے اور انھیں ہمیشہ اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ شام کی حکومت اِس لیے ناراض ہے کہ وہ ان کے حامی فلسطینیوں کو زیادہ مالی امداد نہیں دیتے، عراق ان سے اِس لیے ناراض ہیں کہ ان کی ہمدردیاں عراق کے مقابلے میں ایران کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی التجار نے موجودہ ایرانی حکومت کے لیے بہت سے سودے کرائے ہیں یہی وجہ ہے کہ سابق شاہ ایران کے بیش قیمت خزانے بھی انھوں نے خرید لیے اور لندن منگوا لیے۔ ۱۹۶۸ء کے بعد انھوں نے انگلستان میں کئی محلات اور مشہور قلعے خریدے۔ انگلستان میں ان کے عالیشان محلات کی تعداد دس بارہ ہے۔ جن کی مالیت اربوں پونڈ بتائی جاتی ہے۔ انھوں نے مختلف

کاروباروں میں اربوں پونڈ کماتے لیکن سفارتی مراعات کا سہارا لے کر انگلستان میں ٹیکس ادا نہیں کیا۔ اب برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ ان اقدامات کا اعادہ نہ ہو لیکن کیا وہ مہدی التجار اور دوبتی کے سلطان کے دباؤ کے سامنے جمی رہ سکتی ہے؟

یورپ اور انگلستان میں عربوں کی پھیلتی ہوئی دولت کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں اور تو اور ایسے گمنام عرب امیر بھی ہیں جنھوں نے انگلستان کے قدیم اور نجیب الطرفین لارڈز سے ان کی جاگیروں کے ساتھ ساتھ ان کی خطابات بھی خرید لیے ہیں اور اب وہ اپنے علاقے کے لارڈ ہیں۔ یوں بھی انگلستان میں جگہ جگہ انگریزی کے ساتھ عربی زبان کا استعمال اس بات کی علامت ہے کہ یہ کاروباری قوم عربوں کو اب کتنی اہمیت دیتی ہے، ہر بازار میں عربوں کا عربی زبان میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ یہاں وہاں حلال گوشت اور کھانوں کی دوکانیں بھی موجود ہیں۔ بے شمار سٹوروں اور دوکانوں کی رونق عرب خریداروں کے دم قدم سے ہے جو آنکھیں بند کر کے قیمت دریافت کیے بغیر ہر چیز خریدنے کے عادی ہیں ان سے اچھے گاہک انگریز تاجروں کو بھلا اور کون ملیں گے؟

ہمارے لندن کے قیام کے زمانے میں ہی یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ اُردن کے شاہ حسین نے انگلستان میں ایک ایسا محل خریدا ہے جو شاہی محل بکنگھم پیلس کا ہمسر ہے۔ یہ محل ۱۹۱۳ء میں ہائی گیٹ ہل پر تعمیر کیا گیا تھا اس میں ۶۵ کمرے، بے شمار شاندار ہال، درجنوں زینے اور دوسرے لوازمات ہیں کہا جاتا ہے کہ لندن میں یہ بکنگھم پیلس کے بعد دوسرا سب سے بڑا محل ہے، ایک برطانوی اخبار نے لکھا ہے کہ شاہ حسین نے اپنے ذاتی جیب خرچ کا کچھ حصہ اس محل کو خریدنے پر صرف کر دیا ہے، جو انگلستان کے شاہی خاندان کے لیے باعث رشک ہے، اس محل کی اہمیت کا اندازہ یوں لگاتے ہیں کہ ملکہ میری اور شہزادی الزبتھ اور مارگریٹ اکثر یہاں تقریبات کے سلسلے میں جایا کرتی تھیں۔ شاہ حسین کا ایک ذاتی محل پہلے بھی لندن کے بیش قیمت کین سنگٹن کے علاقے میں موجود ہے۔ ایک

صاحب جو پچھلے دس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ عام تصور کے مطابق یہودیوں کے عالمگیر اثر و رسوخ کا سبب ان کی دولت مندی ہے لیکن عرب دولت کی ریل پیل کے باوجود اب تک دُنیا بھر کے کلیدی مقامات سے یہودیوں کو بے دخل کیوں نہیں کر سکے؟

میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ شاید یہودی دولت کے ساتھ ساتھ عقل اور منصوبہ بندی سے بھی کام لیتے ہیں!!

ذکر ٹیکسی کا !

جس طرح ہر مُلک کا سیاسی اور سماجی نظام جُدا ہوتا ہے اسی طرح ٹیکسیوں کا نظام بھی مختلف ہوتا ہے ۔ ٹیکسی جدید تہذیب کا عطیہ ہے چنانچہ دُنیا کے ہر ملک میں آپ کو ٹیکسی اور ٹیکسی والا نظر آ جاتے گا ۔ مگر ہر ملک کی ٹیکسی اور ٹیکسی والا دوسرے ملک کے ٹیکسی والے سے مختلف ہوتا ہے ۔ اِنگلستان کے ٹیکسی والوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے بہتر ہوگا اگر ہم اپنے ملک کے ٹیکسی والوں کے تذکرے سے اِس قصّے کا آغاز کریں ۔

لاہور میں ٹیکسی اب عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہو گئی ہے ۔ وہ ٹیکسی جسے "یلو کیب" کہا جاتا ہے اور جو ابتدائی دنوں میں لاہور کی سڑکوں کی شان بڑھانے میں حصّہ لیا کرتی تھی اب اِس شہر میں ناپید ہو گئی ہے ۔ کہیں کہیں مخصوص مقامات پر اِکّا دُکّا ٹیکسیاں نظر آ جاتی ہیں مگر وہ عام مسافروں کو گھاس نہیں ڈالتیں ۔ خدا جانے یہ ٹیکسیاں کن مسافروں کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں ؟ اگر کبھی ریلوے اسٹیشن یا ائرپورٹ سے آپ کو ٹیکسی لینی ہی پڑ گئی تو آپ خود اپنے رسک پر ایسا کر سکتے ہیں ۔ ٹیکسی والا آپ سے کتنا کرایہ وصول کرے گا اور منزل تک پہنچنے پر آپ سے کیا سلوک کرے گا ؟ یہ خدا بہتر جانتا ہے یا خود ٹیکسی والا ۔ لے دے کے اب لاہور والوں کو موٹر رکشوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے ۔
اِس موٹر رکشہ والے کا نخرہ اور کرایہ برداشت کرنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں رہی ہے ۔ یقین کیجئے کہ لاہور کی موٹر رکشہ کا کرایہ دُنیا کے بیشتر شہروں کی بہترین ٹیکسیوں کے کرائے

سے زیادہ ہے ۔ آپ جو ذہنی کوفت ، جسمانی جھٹکے اور ڈرائیور کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہے ۔

کراچی میں ٹیکسیاں زیادہ نظر آتی ہیں اور لاہور والے انھیں کراچی کی سڑکوں پر بھاگتے دوڑتے دیکھ کر بہت مرعوب اور خوش ہوتے ہیں ۔ اِن ٹیکسی والوں کا سلوک بھی لاہور کے رکشہ ڈرائیوروں کے مقابلے میں قدرے بہتر ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ لاہور کے ڈرائیوروں کی طرح یہ بھی مرضی کے مالک اور مُوڈی ہوتے ہیں ۔ جی چاہا تو سواری بٹھا لی ۔ ورنہ بے نیازی سے مُنہ موڑ کر چلے گئے ۔ بہت زیادہ اخلاق برتا تو رُکھائی سے کہہ دیا ۔

" ادھر نہیں جانا صاحب ۔ ہم دوسری طرف جانا ہے "۔

جہاں تک کرائے کا معاملہ ہے کراچی کے ٹیکسی والے چند سال قبل تک خاصے معقول تھے لیکن جوں جوں پولیس کی مہربانیاں بڑھتی گئیں ٹیکسی ڈرائیوروں کا رویہ بھی لاڈلے بچّوں کی طرح کا ہو گیا ۔ اب یہ عالم ہے کہ میٹر محض آرائش کی شے رہ گئی ہے ۔ ڈرائیور بے رُخی سے آپ کو دیکھتا ہے ۔ جائزہ لیتا ہے ۔ اگر مسافر معیار پر پورا نہیں اُترا تو خاموشی سے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا ۔ اگر پورا اُترا تو کہہ دیا ۔ "میٹر سے پانچ روپے زیادہ ہوں گے "۔ اب ایک تو میٹر ہی ٹیکسی سے آگے بھاگنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے ۔ اس پر مزید اضافہ ۔ مگر ضرورت مند سر جُھکا دیتے ہیں ۔ کیا کریں ، مجبور ہیں !

ہم لاہور سے کراچی کے ائیرپورٹ پر پہنچے تو بیرونی لاؤنج میں ٹیکسی ڈرائیوروں کا میلہ لگا ہوا تھا ۔ یہ لوگ مسافر کو دیکھتے ہی خوشی سے باچھیں اور ہاتھ پھیلا کر یوں آگے بڑھتے ہیں جیسے مدّت کے بچھڑے ہوئے عزیز مل رہے ہیں ۔ "صاحب ٹیکسی !!" یہ اور بات ہے کہ جس نے "ہاں" میں سر ہلا دیا اس کی سمجھئے شامت آ گئی ۔ آپ کے سامان پر متعدد ٹیکسی والے چیلوں کی طرح جھپٹیں گے اور جس کے ہاتھ میں جو سامان آ گیا اٹھا کر

یہ جا وہ جا۔ اب مسافر کھڑا سوچتا رہ جاتا ہے کہ مَیں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں!
یہ تو ابتدا ہے۔ منزل تک پہنچنے پر وہ ٹیکسی والا آپ سے کیا سلوک کرتا ہے یہ
ایک علیحدہ داستان ہے۔ اور خاصی دُکھ بھری بھی۔ چنانچہ عقل مند مسافران حضرات
کی بھیڑ کو کائی کی طرح چیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور جواب میں صرف اتنا کہتے
ہیں۔" نہیں بھائی۔ ہماری گاڑی آئی ہے۔"

چلیئے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہراول دستے سے تو آپ محفوظ ہو گئے۔ اب آگے
پہنچے تو دیکھا کہ عجیب نظارہ ہے۔ گنتی کی چند ٹیکسیاں ہیں اور بے شمار مسافر سامان
کا انبار لگائے کھڑے ہیں۔ جس ٹیکسی والے کو بُلاتے ہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو پہلے ہی
کسی دوسرے مسافر کا سامان گاڑی میں لاد رہا ہے۔ بھئی ٹیکسی والے۔ بھائی ٹیکسی
اے ٹیکسی ٹیکسی کہہ کر جب حلق خشک ہو گیا تو ایک ٹریفک کانسٹیبل کے کانوں تک
ہماری فریاد پہنچ گئی۔ اس نے پوچھا" صاحب۔ ٹیکسی چاہیئے؟" حالانکہ صاحب سوٹ کیس
اور سامان کے ڈھیر میں دبے ہوتے تھے اور" ٹیکسی، ٹیکسی" پکارتے ہوتے ہماری
آواز بیٹھ چکی تھی۔ خیر۔ کانسٹیبل کی اس نوازش پر ہم مسکراتے اور سر ہلا دیا۔

" اے چنن دین۔ ٹیکسی میں صاحب کا سامان رکھو۔ جلدی۔"

کانسٹیبل نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو آواز دی۔ چنن دین نے چھٹ پٹ ہمارا
سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھر دیا۔ ہمیں اگلی سیٹ پر بٹھایا اور رخصت ہو
ہو گیا۔ ہم کانسٹیبل کے احسان کے بوجھ تلے اتنے دبے ہوئے تھے کہ اس کا شکریہ ادا
کرتے ہوتے نہیں تھکتے تھے۔ اب دیکھئے نا۔ اس طرح کراچی ایئر پورٹ پر محض بیس
منٹ کے بعد ٹیکسی کا مل جانا خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ تو ہم نے چند میل
کا سفر طے کرنے کے بعد دیکھا کہ ٹیکسی کا میٹر بند ہے۔

" ارے بھئی۔ میٹر تو چلاؤ" ہم نے گھبرا کر کہا۔

" میٹر خراب ہے صاحب۔"

" پھر کرائے کا کیا ہو گا۔"

وہ مُسکرایا۔" جو آپ کی مرضی میں آئے اپنی خوشی سے دے دینا۔"

جب ہم ایئر پورٹ سے گلشن اقبال پہنچے اور ٹیکسی والے کو تیس روپے کا نذرانہ
پیش کیا تو وہ نظریں چُرا کر بولا۔" سو روپے ہوں گے صاحب۔" مگر لہجہ ایسا تھا کہ
دیکھو سیدھی طرح سو روپے نکالو ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے۔ پاس پڑوس کا بھی
خیال تھا۔ چپکے سے ہم نے سو روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے اور وہ شکریہ
ادا کیے بغیر ہمارے ہاتھ سے نوٹ چھین کر چلتا بنا۔ جن لوگوں کو پاکستان کی ٹیکسیوں
میں سفر کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے وہ سب اِس تجربے سے گزر چکے ہیں۔
گندی ٹیکسی۔ اس سے بھی گندا ٹیکسی ڈرائیور۔ میٹر بند یا خراب۔ یا اگر حرکت میں ہے
تو اس تیزی سے حرکت کرتا ہوا کہ مسافر کے دل کی حرکت ہی بند کر دے۔ عموماً ٹیکسی
والا آپ سے کہے گا۔" جو مرضی آئے خوشی سے دے دینا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو
مَیں کہوں وہ ادا کر دینا ورنہ۔۔۔

اِس کے برعکس لندن ایئر پورٹ پر آپ کو مسافروں کی ایک لمبی قطار نظر آئے
گی۔ یہ بس کے انتظار میں نہیں ہیں۔ رَش کے وقت ٹیکسی کے منتظر ہیں۔ ٹیکسیاں باری
باری آتی ہیں اور قطار میں سے مسافروں اور سامان کو لے کر رُخصت ہو جاتی ہیں
آواز دینے یا بُلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اگر آپ چاہیں کہ رش کے اوقات
میں قطار بندی کے باہر کھڑے ہو کر ٹیکسی حاصل کر لیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اور
پھر زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بہت زیادہ ہجوم ہو پھر بھی چند منٹ میں قطار
غائب ہو جاتی ہے۔ پھر آپ اس جواب کی توقع بھی نہیں کرتے کہ میں فلاں جگہ نہیں
جا رہا۔ مجھے تو فلاں جگہ جانا ہے۔ اگر آپ لندن پہلی بار آتے ہیں اور اپنی باری

انتظار کیے بغیر ٹیکسی کیلئے پریشان ہیں تو ٹیکسی ڈرائیور آپ کو قطار میں کھڑے
رہنے کا مشورہ دے گا۔ اسی کو آپ انکار سمجھ لیجئے۔

لندن کی ٹیکسیاں ساری دُنیا کی ٹیکسیوں سے مختلف ہیں۔ سالہا سال سے ان
کی موجودہ شکل وصورت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ سیاہ رنگ کی بدشکل ٹیکسی ہوتی
ہے مگر آرام آسائش اور گنجائش کے اعتبار سے دُنیا کی بہترین ٹیکسی ہے۔ جتنے آرام
سے پیر پھیلا کر بیٹھنے کی جگہ اس بدشکل ٹیکسی میں ہوتی ہے آپ کو مرسڈیز اور بیوک
میں بھی نہیں ملے گی۔ ان ٹیکسیوں میں ڈگی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر سامان کم
ہے تو اپنے ساتھ ہی رکھ لیجئے۔ اس میں پانچ مسافروں کے آرام سے بیٹھنے کی گنجائش
بھی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کے درمیان ایک حد فاصل ہے آپ شیشہ کھسکا کر
ڈرائیور آپ کی گفتگو سُننے سے قاصر ہے۔ گویا صحیح معنوں میں یہ ایک پرائیویٹ سواری
ہے جس میں بیٹھ کر آپ ٹیکسی ڈرائیور کو ہمراز بنائے بغیر ہر قسم کی گفتگو بلا خوف وخطر
کر سکتے ہیں۔ ڈرائیور کے ساتھ اور کوئی سیٹ نہیں ہوتی۔ البتہ کھلی جگہ ضرور ہوتی
ہے جہاں اتنا سامان رکھا جا سکتا ہے جو دوسری تین چار ٹیکسیوں میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔
سامان کے لیے آپ کو علیحدہ کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے جو بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ کرایہ نامہ
آپ کی آنکھوں کے سامنے چسپاں ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا ٹیکسی ڈرائیور کے لیے ممکن
نہیں ہے۔ میٹر میں نے کبھی لندن کی کسی ٹیکسی کا خراب نہیں دیکھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا
وائرلیس کے ذریعہ اپنے دفتر سے مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے اور وہ مختلف قسم کی ہدایات
سُنتا رہتا ہے۔

لندن میں ٹیکسی حاصل کرنے کے بھی آداب ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں انگلستان میں
ٹریفک بائیں ہاتھ پر چلتا ہے۔ اس لیے ڈرائیور دائیں ہاتھ پر ہوتا ہے آپ جیسے ہی
خالی ٹیکسی کو اشارہ کرتے ہیں اس کے لیے لازم ہے کہ رُک جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ

ٹیکسی ڈرائیور کسی مسافر کے اشارے کو نظر انداز کر کے گزر جائے۔ خواہ رات اور دن
کا کوئی پہر ہو اور موسم کتنا ہی خوفناک کیوں نہ ہو۔ کوئی سنسان ویران شاہراہ ہو یا
گنجان آبادی ٹیکسی ڈرائیور آپ کے اشارے پر رُکنے کا پابند ہے۔ اب آپ کا کام
یہ ہے کہ ٹیکسی کے نزدیک جائیں۔ ڈرائیور دائیں ہاتھ پر بیٹھا ہے مگر وہ بائیں ہاتھ
والے دروازے کی کھڑکی کا شیشہ اُتار کر آپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے
آپ بلند آواز میں، کھڑکی کے نزدیک منہ لے کر اپنی منزل مقصود بتاتے ہیں اور ٹیکسی
کا پچھلا دروازہ کھول کر بلا تامل ٹیکسی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد غالباً
یہ بھی ہے کہ مسافر کی آواز وائرلیس کے ذریعہ دفتر تک پہنچ جاتی ہے اور انہیں علم
ہو جاتا ہے کہ کس نمبر کی ٹیکسی اب کس طرف جا رہی ہے!! لندن کے ٹیکسی ڈرائیور
کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ شہر کی ہر سڑک محلّے اور گلی کوچے سے بخوبی واقف ہو۔
مسافر نے جو پتہ بتایا ہے وہ سیدھا وہاں پہنچ کر دروازے کے عین سامنے رُک جائے
گا۔ آپ اسے مقررہ کرایہ ادا کریں تو وہ خندہ پیشانی سے "تھینک یو" کہے گا۔ حالانکہ
آپ نے ٹپ نہیں دی ہے۔ اگر آپ اپنی خوشی سے چند پینی بطور ٹپ دیں گے تو
اس کے "تھینک یو" میں گرمجوشی بھی پیدا ہو جائے گی۔

ان سیاہ بدشکل لیکن انتہائی آرام دہ ٹیکسیوں کے علاوہ لندن میں منی ٹیکسیاں
اور ریڈیو ٹیکسیاں بھی موجود ہیں۔ آپ فون کریں اور چند لمحے بعد ٹیکسی آ جائے گی۔ دراصل
دفتر والے آپ کے علاقے میں موجود ٹیکسی ڈرائیور والے کو ہدایت نشر کر دیتے ہیں
اور جو بھی ٹیکسی "موقعہ واردات" کے نزدیک سے گزر رہی ہو وہ دفتر کو مطلع کرنے
کے بعد مسافر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹیکسیاں عام کاروں کی طرح ہوتی ہیں۔ کرائے
میں برائے نام فرق ہے لیکن آسانی بہت زیادہ ہے۔ ریڈیو ٹیکسیوں کی یہ سہولت دُنیا
کے دوسرے شہروں میں بھی مہیا ہے۔ لیکن ہمارے شہر دوسرے ملکوں کے لیے بڑے

شہروں کی دوسری خوبیوں کی طرح اس بنیادی سہولت سے بھی محروم ہیں۔
لندن کے ٹیکسی ڈرائیور کی آمدنی بہت معقول ہے۔ تنخواہ بہت اچھی ملتی ہے
اوورٹائم اس سے بھی زیادہ معقول ہے۔ تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی مل جاتا ہے۔ لیکن
ٹیکسی ڈرائیور بننا آسان نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ڈرائیونگ کا امتحان تو خیر دینا ہی
پڑتا ہے۔ (جو انتہائی مشکل ہوتا ہے) لیکن اس کے علاوہ اس کے لیے یہ بھی ضروری
ہے کہ وہ شہر کے ہر علاقے سے واقف ہو۔ امتحان کے وقت انسپکٹر کسی ایک جگہ کا
نام لے گا۔ اب ٹیکسی ڈرائیور کا فرض ہے کہ وہ قریب ترین راستے سے گزر کر منزل
تک پہنچے۔ اگر وہ پتہ نہیں جانتا تو امتحان میں فیل ہو جاتے گا۔ اور اگر نزدیکی راستہ
چھوڑ کر لمبا راستہ اختیار کرے گا پھر بھی پاس نہیں ہو گا۔

لندن والوں کے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی اس خوبی پر ناز ہے اور حقیقت بھی یہ
ہے کہ دنیا کے دوسرے کسی شہر کے ٹیکسی ڈرائیور شہر کے نقشے اور علاقوں سے اتنے
واقف نہیں ہوتے جیسے لندن کے ٹیکسی ڈرائیور ہوتے ہیں۔ پھر ایک اور بات یہ ہے
کہ کبھی ٹیکسی والا آپ کو سڑک کے دوسری طرف نہیں اتارے گا کہ وہ رہی آپ کی
منزل۔ چلے جائیے۔ بلکہ وہ اس مکان کے عین سامنے دروازے پر ٹیکسی روکے گا اور
آپ کو بتائے گا کہ آپ کی منزل آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لندن کے ٹیکسی والوں
کی ایک خصوصیت ان کا اخلاق اور نرم گفتاری بھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس بار ہمیں
چند ایسے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی واسطہ پڑا جو لندن کے روایتی ٹیکسی ڈرائیور سے
یکسر مختلف تھے۔ یہ تجربہ ہمارے لیے حیران کن بھی تھا اور ناقابل یقین بھی ثابت ہوا
کہ لندن میں بھی ٹیکسیوں کا نظام روبہ انحطاط ہے۔ چند مثالیں آپ کی دلچسپی اور معلومات
کے لیے پیش خدمت ہیں۔

بارش ہو رہی تھی اور لندن کی سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ ہم اپنے ایک

دوست کے ساتھ ایکٹن ٹاؤن سے ہانسلو ویسٹ جا رہے تھے۔ ایک ٹیکسی والے کو اشارہ
وہ رُک تو گئے مگر چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ خدا جانے گھر سے لڑ کر آتے تھے یا
گرل فرینڈ نے ڈانٹا تھا (اس لیے کہ سنتری بادشاہ اور ٹریفک کے سپاہی کے ہاتھوں
تنگ ہونے کا تو یہاں تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا)۔ بہر حال ہم نے حسب دستور اپنی
منزل مقصود بتائی اور اپنے دوست کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ یہ دوست پہلی
بار لندن گئے تھے اور لندن کی سیاہ ٹیکسی میں سوار ہونے کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ
بار بار پریشانی سے ہم سے پوچھتے رہے۔

"پتہ آپ نے پورا بتا دیا ہے نا؟ وہ پتہ جانتا بھی ہے یا نہیں؟ وغیرہ"
ان کی تسلّی کے لیے ہم نے درمیانی شیشہ ہٹا کر ٹیکسی ڈرائیور کو دوبارہ پتہ بتایا۔
جواب میں وہ خاموش رہا لیکن خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ہم نے جھٹ شیشہ بند
کر دیا۔ تھوڑی مسافت اور طے ہوتی مگر ہمارے دوست کے دل کو سکون نہیں تھا۔
انھوں نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔ شیشہ کھسکا کر ڈرائیور سے مخاطب ہوتے۔ "سنو!
تم پتہ سمجھ تو گئے ہو نا۔ ٹیوب اسٹیشن سے کچھ دور آگے چل کر بائیں ہاتھ . . ."
ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی برہمی سے چیخ کر کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اپنا منہ بند رکھو۔"
ہمارے دوست تو خیر بھونچکے رہ ہی گئے لیکن ٹیکسی ڈرائیور کا یہ رویّہ ہمارے
لیے بھی حیران کن تھا۔ ہمارے دوست بھی کچھ دیر میں سنبھل چکے تھے۔ غصّے سے
بولے "چلّانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم آرام سے بات نہیں کر سکتے؟"
ٹیکسی ڈرائیور دھاڑ کر بولا:

"شٹ اپ۔ ورنہ ایسا گھونسہ رسید کروں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔"
ہم نے بات کو بگڑتے دیکھا تو فوراً درمیانی شیشہ بند کر دیا۔ ہمارے

دوست سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ میں اس کی شکایت کروں گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے دوبارہ درمیانی شیشہ ہٹا کر ڈرائیور سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہم نے انھیں روکا اور کہا کہ بھائی شکایت کرنی ہے تو نمبر نوٹ کر لو۔ بلا وجہ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟ شکر ہے کہ وہ ہماری بات مان گئے۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور خاصا مضبوط اور ہٹا کٹا تھا۔ ہو سکتا ہے باکسنگ کا بھی ماہر ہو۔ بہتری اسی میں تھی کہ خاموش ہو جائیں۔ منزل پر پہنچ کر ہم نے مقررہ کرایہ ڈرائیور کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے نہایت بداخلاقی سے نوٹ ہمارے ہاتھ سے چھینے اور گھورتا ہوا منہ میں بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ ہم حیران کھڑے دیکھتے رہے کہ یا اللہ۔ یہ ہم لندن میں کھڑے ہیں یا لاہور میں؟ ٹیکسی ڈرائیوروں کی گھرکیوں، جھڑکیوں اور دھمکیوں کے ہم بے شک عادی ہیں مگر یہ سلوک لاہور اور کراچی میں ہمارے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ کیا لندن میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ واقعی حیرانی کی بات ہے۔

دوسرا واقعہ سُن لیجئے۔ پکا ڈلی میں فلم دیکھ کر ایک اداکار دوست افضال صاحب کے ساتھ باہر نکلے۔ رات کافی گزر چکی تھی ہفتہ کی رات بھی تھی اِس لیے خالی ٹیکسی دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھی۔ ایک ہوٹل سے ہم نے ٹیکسی طلب کرنے کے لیے فون کیا اور دس منٹ بعد ایک سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ ان صاحب کا تعلق نائجیریا سے نکلا۔ انھوں نے مطلع کیا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ہم خاموشی سے ان کی ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ اب انھوں نے جو ٹیکسی چلانی شروع کی تو لندن کی کوئی سڑک نہیں چھوڑی جس پر سفر نہ کیا ہو۔ افضال صاحب ہم سے پوچھنے لگے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ کس راستے سے ہمیں لے جا رہا ہے؟"

ہم نے کہا۔

"بھائی وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ لندن کے راستے ہم سے بہتر جانتا ہے۔"

کچھ دیر اور ٹیکسی چلتی رہی اور ہم ڈرائیور پر اعتماد کیئے بیٹھے رہے۔ مگر پندرہ منٹ بعد احساس ہوا کہ ہم نہ جانے کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔ سڑکیں سنسان اور ویران، عمارتیں نامانوس، ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ یہ کون سا راستہ ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور بھی اب کچھ کنفیوز ہو گیا تھا بولا۔

"شاید میں راستہ بھول گیا ہوں۔"

افضال نے انھیں فوراً ہدایات دینی شروع کر دیں مگر بیس منٹ بعد ہم پھر کہیں بھٹک رہے تھے۔

ہم نے کہا۔

"تم یوں کرو کہ ہیتھرو ایئرپورٹ کی طرف چلو۔ پھر ہم تمھیں راستہ بتا دیں گے۔"

پتہ چلا کہ وہ ہیتھرو ایئرپورٹ کا راستہ بھی نہیں جانتا۔ یہ لندن کا پہلا ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ملا تھا جو ہیتھرو ایئرپورٹ کا راستہ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک جگہ چند لڑکے لڑکیوں کو غل مچاتے اور گاتے ہوئے دیکھا تو ہم نے فوراً کہا۔

"ٹیکسی روک کر ان سے پتہ معلوم کرو۔"

ڈرائیور نے تعمیل کی۔ کافی دیر وہ ان لوگوں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے بعد واپس آیا اور بولا۔

"بس ٹھیک ہے۔"

"راستہ سمجھ تو گئے ہو نا؟"

"بالکل۔ بالکل۔ فکر ہی نہ کریں۔"

اس کے بعد اس نے پھر ہمیں سڑکوں پر گھمانا شروع کر دیا۔ اب رات کے دو بجنے والے تھے۔ بارش اور سردی بھی تھی۔ نیند بھی آرہی تھی۔ اوپر سے راستہ نہ ملنے کی کوفت۔ دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد معلوم ہوا کہ راستہ اب بھی نہیں ملا ہے۔ افضال صاحب نے ڈرائیور کو خوب ڈانٹا:

"تم کیسے ڈرائیور ہو؟ لندن کی سڑکوں کو نہیں جانتے۔ ہیتھرو ائیرپورٹ کا راستہ نہیں جانتے۔"

آدمی شریف تھا۔ خاموشی سے ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا پھر بولا۔

"میں نائیجیریا سے نیا آیا ہوں۔"

"تمھیں ٹیکسی ڈرائیور کس گدھے نے بنا دیا ہے۔ تم نے تو ہماری رات خراب کر دی۔"

وہ چُپ رہا۔ مگر ٹیکسی حرکت میں رہی۔ میٹر کی طرف دیکھا تو وہ چھلانگیں لگا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے لمبے سفر کے بعد کرایہ تو بڑھنا ہی تھا۔ منزل کا اب تک کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔

ایک جگہ پھر ہمیں فرشتوں کا غول مل گیا۔ اس بار لڑکے لڑکیاں سڑک کے بیچوں بیچ بارش میں بیٹھے ہوئے گا رہے تھے۔

"روکو۔ روکو۔ ٹیکسی روکو۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا اناڑی پن ملاحظہ فرمائیے کہ سائیڈ میں روکنے کی جگہ اس نے اسی جگہ بریک لگا دیا۔

وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سڑک پر کوئی ٹریفک نہ تھا ورنہ خیر نہ ہوتی۔ اس مرتبہ

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور پر بھروسہ نہیں کیا۔ خود اس غول بیابانی کے پاس گئے۔ ہمیں دیکھ کر لڑکے لڑکیوں نے نعرے مارنے شروع کر دیئے۔

"وہ آگئے وہ آگئے۔"

پھر انھوں نے تالیاں بجا بجا کر "وہ آگئے" کا نغمہ کورس میں گانا شروع کر دیا۔ ہم ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب ان کی نغمہ سرائی بند ہوئی تو ان سے ہیتھرو ائیرپورٹ کا راستہ پوچھا۔ ایک لڑکے نے بائیں جانب جانے کا مشورہ دیا۔ دوسری لڑکی نے لڑکھڑاتے ہوئے دائیں جانب جانے کو کہا۔ ایک درمیانی عمر کے صاحب خاموشی سے اُٹھ کر ہمارے پاس آئے۔ نہایت سنجیدگی سے انھوں نے ہمیں راستہ سمجھایا۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ان مدہوشوں میں ایک صاحب ہوش بھی موجود ہے۔ مگر جب ہم ان کا شکریہ ادا کر کے پلٹے تو انھوں نے اچانک ایک نعرۂ رندانہ لگایا اور دوڑ کر ہماری ٹیکسی کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور پھر جو انھوں نے شور مچایا ہے تو بمشکل دوسرے لڑکے لڑکیوں نے انھیں زبردستی پکڑ کر ٹیکسی کی چھت سے اتارا ورنہ وہ شاید صبح تک وہیں بیٹھ کر نغمہ سرائی کرتے رہتے۔ مگر انھوں نے پتہ درست بتایا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ایم فور پر پہنچ گئے اور وہاں سے گھر کا راستہ مل گیا۔ رات کے تین بجے فلیٹ کے سامنے ٹیکسی رُکی تو افضال صاحب پوچھنے لگے۔

"کرایہ تو بہت بن گیا ہے۔ اس کو کیا دوں؟"

ہم نے مشورہ دیا۔

"اس کو گالیاں دے کر بھگا دو۔"

کہنے لگے۔

"نہیں آفاقی صاحب۔ یہ بے چارہ لندن میں نیا ہے اور غریب طبیعت لگتا ہے۔ پھر تیسری دُنیا کی مخلوق ہے۔ اس کو پچیس پونڈ دے دیتے ہیں۔" حالانکہ صحیح کرایہ

دس بارہ پونڈ سے زیادہ نہ بنتا۔

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا،

"تمھیں کتنے پیسے ادا کریں؟"

وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ پچیس پونڈ ملے تو اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ ڈھیر سارا شکریہ ادا کر کے وہ جانے لگا تو ہم نے اسے واپسی کا پتہ پھر تفصیل سے سمجھایا اور وہ شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ بعد میں ہم نے جب یہ واقعہ لندن میں رہنے والوں کو سنایا تو انھیں قطعی یقین نہ آیا۔ مگر ہمارے پاس ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے۔

ایک بار ہم نے رات گئے ریڈیو ٹیکسی ایک ہوٹل سے فون کر کے طلب کی۔ یہ سٹرڈے نائٹ تھی اور ہم خالی ٹیکسی کی شکل کو ترس گئے تھے۔ ہمارے ساتھ چند خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک اداکارہ ہیں۔ یہ بھی پکاڈلی سرکس کا واقعہ ہے۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ اس سے پہلے فلم ایکٹرس خاتون نے ایک خالی ٹیکسی کھڑی دیکھی تو پاس جا کر دریافت کیا۔ "ٹیکسی خالی ہے؟" رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا اور اخبارات کے تازہ ایڈیشن فروخت ہو رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اطمینان سے ٹانگیں پھیلاتے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے خاتون کے سوال کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ دوسری بار چکر کاٹ کر اس کی کھڑکی کے پاس گئیں اور بولیں۔

"ہیلو۔ ہیلو ایکسکیوزمی . . . ."

ٹیکسی ڈرائیور نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور غصے سے بولا۔ "گم ہو جاؤ" اور پھر اخبار بینی شروع کر دی۔ اس حرکت پر ہماری ہم سفر بہت برہم تھیں اور جب ہم ریڈیو ٹیکسی میں بیٹھے جا رہے تھے تو وہ لندن کے ٹیکسی ڈرائیوروں پر برس رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

"ہم خواہ مخواہ اپنے لاہور کے ٹیکسی والوں کو برا کہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے لندن کے ٹیکسی والے کتنے بدتمیز اور ذلیل ہیں۔ بالکل جنگلی۔ انھیں تو عورتوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

وہ اردو میں بات کر رہی تھیں جب انھیں گرجتے برستے کافی دیر ہو گئی تو انگریز ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا اور نہایت خوش اخلاقی سے اردو میں کہنے لگا۔

"بیگم صاحبہ، سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

اگر بیگم صاحبہ اور ہم پر بم پھٹا ہوتا تو شاید ہم اتنے پریشان نہ ہوتے۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ دراصل بیگم صاحبہ اتنی دیر میں لندن والوں کی شان میں بہت زیادہ گستاخی کر چکی تھیں اور جب ہمیں احساس ہوا کہ یہ انگریز تو سب کچھ سمجھ رہا تھا تو سخت شرمندگی ہوئی۔ بعد میں خاصی تفصیل سے گفتگو ہوئی یہ انگریز ڈرائیور کلکتہ میں پیدا ہوا تھا اور بائیس سال کی عمر تک وہیں رہا تھا۔ اس لیے اردو خوب بولتا اور سمجھتا تھا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ٹیکسی والے بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ روم میں ٹیکسی والے سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ وہ آپ کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طویل ترین راستے سے منزل پر لے جائے گا۔ ایک بار تو ہم نے رات کو دس پندرہ میل کا کرایہ ادا کیا اور صبح دیکھا کہ ہم جہاں سے رات آتے تھے وہ جگہ ہمارے ہوٹل کے عقب میں ہی تھی اور ہمارے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی تھی۔ روم کے ٹیکسی والے انگریزی "یس اور نو" سے زیادہ نہیں جانتے۔ انگریزی یہ بولنا پسند بھی نہیں کرتے اگر آپ کسی بات کی شکایت کریں گے تو وہ اطالوی زبان میں ایک لامتناہی تقریر شروع کر دیں گے۔ بار بار اسٹیئرنگ کو چھوڑ کر ہاتھوں کے اشارے کریں گے اور نان اسٹاپ بولتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ کی منزل آجائے گی اور آپ کان دبا کر کرایہ ادا

کرنے میں ہی عافیت سمجھیں گے ۔ پیرس میں ٹیکسیاں بہت اچھی اور صاف ستھری ہوتی ہیں ۔ جدید ماڈلز کی قیمتی کاریں ٹیکسی کے طور پر چلتی ہیں ۔ ڈرائیور بھی صاف ستھرے ہوتے ہیں ۔ پیرس میں اگر آپ خاتون ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے تو مدہوش کن خوشبو آپ کو مفت سونگھنے کو ملتی ہے ۔ پیرس کے سیاہ فام ٹیکسی ڈرائیور زبان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ جب مناسب سمجھتے ہیں انگریزی سے نابلد بن جاتے ہیں، ایک بار ہم ایئرپورٹ سے ہوٹل پہنچے تو ڈالر ہی ہمارے پاس موجود تھے ۔ ہم نے بلیک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ ان بیس ڈالرز میں کتنے فرانکس ہوں گے، اُس نے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا اور ہمارے ہاتھ سے نوٹ لے کر چلتا بنا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کرایہ سات آٹھ ڈالر سے زیادہ نہیں بنتا تھا ۔ پیرس میں اگر آپ کو ایشیائی خصوصاً پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور مل جاتے تو جانیے عید ہو گئی ۔ آپ کی بھی اور ٹیکسی ڈرائیور کی بھی ۔ اتنی گرمجوشی اور خلوص سے ملے گا اور باتیں کرے گا کہ آپ جذباتی ہو جائیں گے ۔ ایک بار ایک گوجرانوالہ کے لڑکے نے (جو دس سال سے پیرس میں تھا) ہم سے نہ صرف کرایہ وصول نہیں کیا بلکہ بچیوں کو ٹافی کا پیکٹ بھی پیش کیا ۔ ہم نے بہت رد کا اور کہا " بھئی یہ کیا ہے" ۔ بولا ۔

"چاچا کی طرف سے تحفہ"

جنیوا کے ٹیکسی والے بھی اپنی ٹیکسیوں کی طرح صاف ستھرے ہوتے ہیں ۔ مگر ایک بار جنیوا میں بھی ایک ٹیکسی والے نے ہمیں لمبا چکر دے کر زیادہ کرایہ وصول کیا ۔ جس کسی کو ہم یہ واقعہ بتاتے ہیں وہ یقین نہیں کرتا حالانکہ یہ حقیقت ہے ۔ یورپ کے ممالک میں ٹیکسیاں بھی نہایت عمدہ ہوتی ہیں اور ٹیکسی والے بھی مگر امریکہ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ۔ یہاں پر ٹیکسی والے عموماً بااخلاق تو ہوتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ وصول نہیں کرتے مگر ٹیکسیاں صاف ستھری نہیں ہوتیں ۔ خصوصاً

سیاہ فام لوگوں کی ۔ پھر وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے اکثر سگریٹ نوشی کرتے رہتے ہیں اور مسافر سے معذرت تک نہیں کرتے ۔ کافی یا کوک کا ڈبہ پیتے ہوئے تو اکثر ٹیکسی ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوتے نظر آجائیں گے ۔ حالانکہ یہ جرم ہے ۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن ایک بار ہم نے رات کے وقت واشنگٹن میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا جو ہم سے تھوڑا آگے جا رہا تھا اور آم کھا رہا تھا ۔ ہے نا تعجب کی بات!؟

انڈیا ہم آزادی کے بعد نہیں گئے ۔ مگر سُنا ہے کہ وہاں ٹیکسیاں کباڑی کا مال نظر آتی ہیں ۔ ٹوٹی پھوٹی اور گندی ۔ ڈرائیور بھی ویسا ہی ۔ مگر بداخلاقی نہیں کرتے ۔ البتہ مسافر کو چکر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے ۔ دُنیا میں بہترین ٹیکسیاں اور ٹیکسی ڈرائیور جاپان کے ہوتے ہیں ۔ مگر یہ تذکرہ ہی بے کار ہے ۔ آج کل تو جاپان کی ہر چیز ہی نمبر اوّل ہے ۔

کولمبو میں ٹیکسیاں عموماً مورس پندرہ سو ملیں گی ۔ اتنی بوسیدہ کہ لگتا ہے ہاتھ لگاتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی ۔ ڈرائیور اس سے بھی زیادہ بدحال ۔ ٹیکسی چلتی ہے تو لگتا ہے زلزلہ آگیا ہے ۔ مگر اُن کے میٹر اکثر دُرست ہوتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ کئی ٹیکسی ڈرائیور خراب میٹر ظاہر کر کے زبانی کرایہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ زیادہ ہوتا ہے ۔ بنکاک میں میٹر کا رواج ہی نہیں ہے ۔ موٹر رکشہ اور ٹیکسی والے سے باقاعدہ پیشگی کرایہ طے کرنا پڑتا ہے ۔ دوسرے دکانداروں کی طرح یہ بھی مول تول کرتے ہیں ۔ دو سو بھات سے شروع ہو کر تیس چالیس بھات پہ بھی رضامند ہو جاتے ہیں ۔ گویا ناتجربہ کار اور اجنبی مسافروں کی شامت ہے ۔ ٹیکسیاں عام طور پر پُرانی اور خستہ ۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان سے میچ کرتے ہوتے ۔ البتہ ایک خاص بات ہم نے یہ دیکھی کہ بنکاک کی پُرانی ٹوٹی پھوٹی ٹیکسیوں میں بھی ایئرکنڈیشنر لگا ہوتا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے وہ کوئی اضافی کرایہ وصول نہیں کرتے ۔ غالباً اس لیے کہ بنکاک میں عموماً موسم گرم ہوتا ہے اور ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے ۔ اس لیے مسافر ایئرکنڈیشنر ٹیکسیوں کو ترجیح دیتے ہیں ۔

ارب پتی مصنّف

کتابیں اور ناول ہمارے مُلک میں بھی لوگوں نے لکھے ہیں اور بہت زیادہ، لکھے ہیں ۔ پاکستان کے زود ترین لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو کا نام سرِفہرست ہے ۔ وہ ایک ایک دن میں دو دو، تین تین افسانے لکھ ڈالتے تھے ۔ انھیں بیس منٹ میں ایک افسانہ لکھتے ہوتے ہم نے بھی دیکھا ہے ۔ ان کی کتاب "گنجے فرشتے" میں شامل بیشتر خاکے انھوں نے روزنامہ "آفاق" لاہور کے لیے لکھے تھے ۔ ان میں سے بعض خاکے انھوں نے اس طرح لکھے کہ اخبار کے دفتر میں آتے، کُرسی پر اکڑوں بیٹھے، قلم اُٹھایا اور قلم برداشتہ لکھنا شروع کر دیا ۔ وہ جب ایک بار لکھنا شروع کرتے تھے تو اس افسانے یا خاکے کو مکمل کر کے ہی اُٹھتے تھے ۔ انھوں نے اپنی کوئی تحریر دو نشستوں میں نہیں لکھی ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ناول نہ لکھ سکے ۔ ایک بار سے زیادہ بیٹھ کر کوئی چیز لکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی ۔ ان کی بے چینی، مضطرب مزاجی اور پارہ صفتی طویل اور مسلسل تحریروں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ۔ منٹو صاحب نے بہت زیادہ لکھا اور زیادہ تر بہت خوب بھی لکھا لیکن اس کے معاوضے میں انھیں کیا ملا؟ ان کی کتابیں کتنی تعداد میں شائع ہوتیں؟ اور ان کی اشاعت سے انھیں یا ان کے خاندان کو کتنا پیسہ ملا؟ شاید ہزاروں بھی نہیں ۔

پاکستان کے ایک اور مقبول مصنّف ابن صفی مرحوم گزرے ہیں ۔ نوعمر نسل میں

وہ بہت زیادہ پسند کیے جاتے تھے ۔ کہتے ہیں انھوں نے ایک ماہ میں دو ناولوں کے اوسط سے بھی لکھا ہے ۔ اور بعض اوقات ایک ماہ میں کئی کئی ناول لکھ ڈالے ۔ ان کے ناول پڑھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی ۔ پبلشروں کے ستم سے محفوظ رہنے کی خاطر انھوں نے اپنے ناولوں کو بذاتِ خود شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور غالباً اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں انھوں نے اپنی تحریروں سے کہیں زیادہ روپیہ کمایا ۔ اب ذرا یہ ملاحظہ فرمایئے کہ بیرونی، خصوصاً ترقّی یافتہ اور تعلیم یافتہ ملکوں میں لکھنے والوں کی کتنی پذیرائی ہوتی ہے اور وہ کتنی دولت کماتے ہیں ؟

ٹائمز لندن نے ایک جائزے میں لکھا کہ ساری دنیا میں صنعت کاروں، اسمگلروں اور تیل کے تاجروں کے علاوہ اب ارب پتیوں کی ایک نئی قسم پیدا ہو چکی ہے ۔ یہ مصنّف ہیں، ناولیں اور کتابیں لکھنے والے لوگ، جن کی تصنیفات کروڑوں کی تعداد میں بکتی ہیں اور انھیں رائلٹی کے طور پر اربوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے ۔ ان مقبول لکھنے والوں کے پاس ہر وہ نعمت اور آسائش ہے جو دوسرے دولت مندوں کو مہیّا ہے ۔ کئی ملکوں میں شاندار مکانات، کاریں، ہوائی جہاز، کچھ ناول نگاروں نے تو اپنے پسندیدہ مقامات پر پورے پورے جزیرے خرید لیے ہیں اور وہاں بیٹھ کر زندگی کی آسائشوں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں یا پھر لکھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ یہ نہ سمجھیے کہ اتنی دولت کمانے کے لیے انھیں مسلسل اور متواتر لکھنا پڑتا ہے ۔ جی نہیں ۔ کسی مصنّف کا ایک ناول اگر مقبول ہو جائے تو وہ کروڑ پتی بن جاتا ہے ۔ ترقّی یافتہ معاشروں کی یہی پہچان ہے ۔ ایسے معاشرے اپنے ادیبوں اور فن کاروں کو غمِ روزگار سے مکمّل طور پر آزاد کر دیتے ہیں ۔ انھیں سسک سسک کر اور رینگ رینگ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرتے ۔

انگلستان میں انگریزی کی مقبول اور محبوب مصنّف باربرا کارٹ لینڈ کی ۸۲ ویں

سالگرہ کے موقع پر ان کے بارے میں بہت دلچسپ اور معلومات آفریں تفصیل علم میں آئی جو آپ کی اطلاع بلکہ عبرت کے لیے پیش کرنا ضروری ہے۔

باربرا کارٹ لینڈ پچھلی نصف صدی سے زائد عرصے سے انگریزی زبان کی معروف و مقبول ناول نگار ہیں۔ اس عرصے میں انھوں نے چار سو سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں جو مغربی معیار سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کے عوض ان کو اربوں پونڈ حاصل ہوتے جو ان کی آئندہ کئی نسلوں کی خوش حال زندگی کے لیے کافی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان میں وہ اور شہزادی ڈیانا یکساں مشہور ہستیاں ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق آج تک ان کے تین ارب نوّے کروڑ ناول فروخت ہو چکے ہیں۔ آمدنی کا اندازہ اربوں پونڈز ہے۔ باربرا کارٹ لینڈ نے رومانی ناولوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی کتابیں لکھی ہیں مگر ان کی شہرت اور مقبولیت کی بنیادی وجہ مخصوص انداز کے رومانی ناول ہی ہیں۔ تمام تر شہرت اور دولت کے باوجود باربرا کارٹ لینڈ ایک تنہا اور اداس عورت ہیں۔ یوں تو چرچل، گاندھی، ماؤنٹ بیٹن سے لے کر اندرا گاندھی تک دُنیا کی بہت بڑی بڑی ہستیاں ان کے حلقۂ احباب میں شامل رہی ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ میں ان کے والد ہلاک ہو گئے تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ان کے دونوں بھائی مارے گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ ہی میں ان کے دوسرے شوہر بھی زخمی ہو کر مر گئے۔ اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔ تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ناول لکھنے کے لیے انھیں سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مضامین اور کردار خود بخود ان کے دماغ میں آ جاتے ہیں۔ وہ تین سو تیس الفاظ فی گھنٹہ کی اوسط سے لکھواتی ہیں۔ ان کی عمر ۸۳ سال ہے مگر وہ چاق و چوبند ہیں اور کہتی ہیں کہ فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

انگریزی کے ایک مصنف جیفری آرچر نے گزشتہ سال چار لاکھ ستر ہزار پونڈ ٹیکس

ادا کیا ہے۔ ان کی آمدنی کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ان کی تازہ ترین ناول مہنگی کتابی صورت میں ۷۰ ہزار سے زائد بک چکی ہے۔ سستی طباعت میں اس کی فروخت لاکھوں میں ہے۔

ہمارے ہاں ادبی حلقے اس بات پر ماتم کناں رہتے ہیں کہ ادبی تصانیف کے مقابلے میں ہلکی پھلکی ناولیں زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان میں بھی صورت حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جین آسٹن، چارلس ڈکنز، ڈی ایچ لارنس، ایولین واگ جیسے معتبر ادبی جناتوں کی کتابوں کے مقابلے میں جدید مصنفوں کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہو رہی ہیں۔ ای ایم فارسٹر کی کتاب "اے پیسیج ٹو انڈیا" اس سال فروخت کا نیا ریکارڈ قائم کرنے والی ہے۔ ڈیوڈ ایٹن برو کی کتاب "یونگ پلانٹ" کی (مہنگی طباعت میں) پانچ لاکھ کے قریب جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ سستی کتابوں کی فروخت اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پبلشر اب ایسی کتابوں کی تاک میں رہتے ہیں جو بہت زیادہ بکتی ہوں۔ ایک ناشر کا کہنا ہے کہ اس کے منافع کا نوّے فیصد حصّہ ہلکی پھلکی ناولوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خالص ادبی کتابوں کی فروخت ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ فی زمانہ فکشن کی مانگ ہے۔ اگرچہ معلوماتی کتابوں کی اشاعت بھی بہت زیادہ ہے۔ "گینز بک آف ریکارڈ" کی ہر سال پانچ لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری آج بھی بہت زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل ہے اور ہر سال اس کی اوسطاً سات آٹھ لاکھ کاپیاں بک جاتی ہیں۔ ڈکشنری خریدنے والوں میں محض لائبریری اور طلبہ ہی نہیں ہوتے، عام لوگ بھی ڈکشنری کے خریداروں میں شامل ہیں۔ اس کی مانگ ہمیشہ رہی ہے اور اس کی طباعت کا سلسلہ تمام سال جاری رہتا ہے۔

انگلستان میں کتابوں کی اشاعت کا کیا عالم ہے؟ اس کا اندازہ یوں لگا سکتے کہ

۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک ہر سال تقریباً ۲۴۴۶۵ نئی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن گزشتہ سال مطبوعات کی تعداد ۳۸۹۸۰ ہوگئی۔ اب ان کی فروخت کا جائزہ لیجئے۔ ۱۹۸۳ء میں انگلستان میں ۷ ارب ۷ کروڑ پونڈ مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

فکشن اور کلاسکی کتابیں = ایک ارب ۹۰ کروڑ پونڈ۔
اسکول کی ٹیکسٹ بکس = ایک ارب پندرہ کروڑ پونڈ
ٹیکنیکل اور سائنسی کتابیں = ایک ارب ۹ کروڑ پونڈ
بچوں کی کتابیں = ۶۳ کروڑ پونڈ
متفرق کتابیں = دو ارب ۱۰ کروڑ پونڈ

انگلستان میں ہر سال ایک ارب دو کروڑ پونڈ کے لگ بھگ مالیت کی "بائبل" بھی فروخت ہو جاتی ہے۔

رومانی ناول اور کہانیاں سب سے تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ہر تین میں سے ایک عورت یہ کتابیں پڑھتی ہے۔ ہر ماہ تقریباً بیس نئے رومانی ناول شائع ہوتے ہیں۔ رومانی ناول لکھنے والوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے جن میں سے اکثر قلمی اور فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ کئی حضرات زنانہ ناموں سے خواتین کے پسندیدہ رومانی ناول باقاعدگی سے لکھتے ہیں اور ان کے نام خاصے مقبول بھی ہیں۔ حال ہی میں انگلستان میں لکھنے والوں کے مفاد میں ایک نئی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اس کی رُو سے لائبریریوں سے کرائے پر دی جانے والی کتابوں پر بھی مصنف کو رائلٹی دی جاتی ہے اور صرف اس ایک مد سے مصنف اوسطاً پانچ ہزار پونڈ سالانہ کما لیتا ہے۔ اس ایک مثال سے آپ انگلستان کے لکھنے والوں کی آمدنی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رومانی مصنفین کے ناول پڑھنے والے قارئین کی تعداد آٹھ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ

ہے جب کہ انگلستان کی کُل آبادی بھی اتنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قاری متعدد ناول پڑھتا ہے۔ لائبریریوں سے ہر سال ۸۰ لاکھ کے لگ بھگ قاری رومانی اور مقبول مصنفین کی کتابیں لے جاتے ہیں جب کہ اساتذہ کے قارئین کی تعداد ۸۰ لاکھ کے قریب ہے۔ انگلستان کے مقبول لکھنے والوں کی کتابیں سارے سال چھپتی رہتی ہیں۔

لکھنے والوں کی کمائی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ تمام زندگی ان کا واسطہ صرف دو چیزوں سے رہتا ہے۔ ان کے ناشر سے یا پھر ان کے اکاؤنٹنٹ سے" ایک مقبول ترین مصنف آٹھ لاکھ سے ۲۳ لاکھ پونڈ سالانہ تک کماتا ہے۔ فلموں، ٹیلیویژن اور جرائد سے وصول ہونے والی رقم اس کے علاوہ ہوتی ہے، یہ آمدنی محض انگلستان کے لیے ہے۔ غیر مُلکی حقوق فروخت کرنے سے ایک مقبول مصنف کو اوسطاً ساڑھے سات لاکھ پونڈ سے ایک کروڑ پانچ لاکھ پونڈ تک حاصل ہو جاتے ہیں۔ فلم اور ٹی وی سے ہونے والی آمدنی بھی ۲۵ ہزار سے ڈھائی لاکھ پونڈ سالانہ تک ہو جاتی ہے۔ انگریزی مصنفین کی کتابیں امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ جرمنی، فرانس، اسپین، میکسیکو، ہالینڈ، جاپان، اٹلی، جنوبی امریکہ، اسرائیل، ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور فن لینڈ میں بھی فروخت ہوتی ہیں اور ان تمام ممالک کے حقوق کے عوض مصنف کو معقول رقم حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام اعداد و شمار کے باوجود بعض اوقات کوئی مصنف یک مُشت رقم لے کر بھی اپنی کتاب دے دیتا ہے۔ مثلاً ایک مصنف پیٹرک مونٹیگ اسمتھ نے ملکہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک کتاب لکھی جس کی قیمت ساڑھے بارہ پونڈ تھی۔ اس نے کتاب کا مسوّدہ صرف پانچ سو پونڈ کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر وہ اس پر تین فیصد رائلٹی بھی حاصل کرتا تو اب تک ڈیڑھ لاکھ پونڈ کما چکا ہوتا۔

انگلستان میں ہر ماہ بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی تعداد اِتنی زیادہ ہے کہ ان کا پڑھنا خود نقادوں کے لیے بھی مشکل ہے۔ کوئی کیا کیا پڑھے اور کہاں تک پڑھے۔ اگرچہ تبصرے لکھنے والے بھی بہت سے ہیں اور انھیں کتابیں پڑھنے کے لیے مناسب وقت اور تبصرہ لکھنے کے لیے معقول معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ مگر کتابوں کی اشاعت جس رفتار سے ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر ان کا مطالعہ کرنا بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ کتابیں ہر موضوع پر چھپتی ہیں اور یہ نہیں کہ ان کی موجودگی ہمارے دستور کے مطابق محض پریس ہی محسوس کرتا ہے۔ یہ قوم مطالعہ کی شائق ہے۔ ریستورانوں، ٹرینوں، بسوں، اسٹیشنوں، بس اسٹاپوں پر ہر جگہ آپ لوگوں کو مطالعے میں محو پائیں گے۔ انتہا تو یہ ہے کہ آپ کوئی دلچسپ فلم دیکھنے گئے ہیں۔ مگر وقفے کے دوران بیشتر حاضرین کتاب یا اخبار سے شوق فرماتے نظر آئیں گے۔ تمام کتابوں کو پڑھنے کی ہمت تو خود لندن والوں میں بھی نہیں ہے۔ پھر ہم تو مسافر تھے۔ ظاہر ہے اِتنی سکت نہیں رکھتے تھے لیکن کتابوں پر تبصرے پڑھ کر تسلّی کر لیا کرتے تھے۔ اِس سرسری مطالعے کے دوران بعض دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ زمانہ قدیم کے بیشتر جنگ جُو فاتح مطالعے کے شوقین تھے۔

نپولین کے بارے میں یہ تحقیق کی گئی کہ اسے فتوحات کے سوا اگر کسی اور چیز سے دلچسپی تھی تو وہ تھی کتاب۔ موصوف ہر موضوع پر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ مطالعے کا انداز یہ تھا کہ جو کتاب پسند نہ آتی وہ کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ جب کسی مہم پر جاتے تھے تو کتابوں کا انبار بھی ساتھ چلتا تھا۔ فُرصت کے اوقات میں کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ نپولین کو جب معزول کر کے سینٹ ہیلینا میں قید کیا گیا تو اس کی سب سے بڑی فرمائش کتابوں کے بارے میں تھی۔ چنانچہ اس قید خانے میں ایک بہت بڑا کتاب گھر بن گیا۔ ہٹلر کے بارے میں بھی ایک صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ ہٹلر کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔

جب کبھی دُنیا کو زیر و زبر کرنے کے منصوبوں سے فُرصت ملتی تھی موصوف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ سکندرِ اعظم کے بارے میں بھی یہی بتایا گیا۔ سکندر نے ۲۲ سال کی عمر میں قریباً آدھی دُنیا فتح کر لی تھی۔ مگر عالم یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب۔ سکندر، عالموں اور فلسفیوں کا جتنا مدّاح اور قدردان تھا وہ سب کو علم ہے۔ حکیم دیو جانس کلبی سے ملاقات کے لیے ان کے پاس فاتح عالم خود چلا گیا۔ موصوف دھوپ سینک رہے تھے۔ سکندر کافی دیر کھڑا رہا مگر دیو جانس کلبی نے سر اُٹھا کر نہ دیکھا۔ آخر سکندر نے تنگ آ کر پوچھا:

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں؟"

جواب ملا "ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

سکندر اور اس کے یگانۂ روزگار اتالیق ارسطو کے واقعات تو اب تاریخ کا حصّہ ہیں۔ ارسطو کی سکندر نے کتنی پاسداری اور عزت کی وہ سبھی جانتے ہیں۔ ظاہر ہے جس کو علم کا شوق نہ ہوگا وہ عالموں کا قدردان کیسے ہو سکتا ہے؟

مصوّری کے بارے میں ایک اور کتاب میں سکندر کے ایک مصاحب کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ سکندر مصوّروں کا شیدائی تھا۔ ایک بار اس نے اپنے عہد کے مشہور مصوّر ایپلیس کو طلب کیا اور اپنی محبوب کنیز کی تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ مصوّر نے دلجمعی سے تصویر بنائی۔ بادشاہ نے تصویر دیکھی تو اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار پکار اُٹھا۔

"بخدا اِس لڑکی پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔"

یہ کہا اور اپنی محبوبۂ دلنواز مصوّر کو بخش دی۔

مصوّری اور مصوّروں کے بارے میں ایک اور کتاب پچھلے دنوں شائع ہوئی ہے۔ دوسو تینتیس صفحات ضخامت کی اِس کتاب کی قیمت پندرہ پونڈ ہے۔ مصنّف نے

یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جتنے بھی مشہور مصوّر گزرے ہیں ان کی عورتوں کی مصوری اس بات کا نتیجہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کے حسن و جمال کے معترف تھے۔ بلکہ ایک مصوّر گریر کے مطابق "عورتوں کو یہ محض خوش فہمی ہی ہے کہ مرد اُن کے پرستار ہوتے ہیں۔ ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ مرد اُن سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔"

اِس کتاب کے مصنّف ایڈون ملینز کا کہنا ہے کہ دُنیا کے مشہور مصوّروں نے جس قدر مہارت سے خراب عورتوں کی تصویر کشی کی ہے اتنی توجّہ عورتوں کی معصومیت کو پینٹ کرنے پر نہیں دی۔ چنانچہ انھوں نے یہ نچوڑ نکالا کہ پکاسو نے عورت کا جس طرح حُلیہ بگاڑا ہے اس کے پس پردہ مصوّر کی نفرت اور چُھپی ہوئی نامکمّل خواہشیں کارفرما ہیں۔ مصنّف کے الفاظ میں محض چار مصوّر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے عورت کی تصویر کشی کے سلسلے میں نفرت اور حقارت کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ کیبرانٹ، گویا، تولوز اور داتیو ہیں۔ ان کے سوا کسی نے بھی عورت کو احترام تقدّس اور محبّت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنے اس نظریّے کو ثابت کرنے کے لیے مصنّف نے بے شمار تصاویر کا حوالہ بھی دیا ہے۔

٭

اُردو مرکز اور اُستاد دامن

لندن میں "اُردو مرکز" کی رونق افتخار عارف کے دَم سے ہے۔ اُردو کا کوئی بھی قابلِ ذکر (اور ناقابلِ ذکر) صاحبِ قلم ایسا نہیں ہے جو لندن کی فضاؤں سے پرواز کرتا ہوا گزر جاتے اور افتخار عارف کے ہاتھ نہ آتے۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، امریکی، یورپی ملک کے اُردو ادیب و شاعر جب انگلستان آتے ہیں تو افتخار عارف کو خبر ہو جاتی ہے اور وہ انھیں پکاڈلی کے اُردو مرکز میں کھینچ بُلاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہ مثل مشہور تھی کہ فلاں شخص تو اِتنا ہوشیار ہے کہ اُڑتی چڑیا کے پَر گِن لیتا ہے۔ افتخار عارف اُڑتے طیارے میں سفر کرنے والے مسافروں کو گِن لیتے ہیں اور انھیں اُردو مرکز کی ہَوا کھلائے بغیر واپس نہیں جانے دیتے۔

مئی کے آخری ہفتے میں "اُردو مرکز"، لندن میں ایک ایسی ہی تقریب منعقد ہوئی۔ اِس بار یہ اُردو کی نہیں بلکہ پنجابی زبان کے مایۂ ناز شاعر اُستاد دامن کی یاد منانے کے لیے برپا کی گئی تھی۔

اِس تقریب کی ایک خوبی تو اُوپر بیان ہو چکی ہے کہ "اُردو مرکز" میں ایک پنجابی شاعر کو خراجِ تحسین اَدا کیا جا رہا تھا۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ یہ ایک فری اسٹائل محفل تھی۔ جس کا جس زبان میں جی چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ چنانچہ بیشتر حضرات نے اُستاد دامن کے بارے میں پنجابی زبان میں مضامین پڑھے اور خوب داد

وصول کی ۔ اُستاد دامن پاکستان کی مشہور ہستی تھے ۔ ان کے بارے میں سبھی قابلِ ذکر باتیں سب لوگ جانتے ہیں ۔ بے نیاز، بے پروا، فقیر منش ۔ ایک حجرے میں انھوں نے ساری زندگی گزار دی ۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صِلے کی پروا" ۔ یہ مصرعہ استاد دامن پر پورا صادق آتا تھا ۔ جس شخص کو لباس کے معاملے میں محض ایک لُنگی اور کُرتہ درکار ہو ۔ (جاڑے میں اس پر ایک موٹی چادر کا اضافہ ہو جاتا تھا ۔) جسے شعر و شاعری اور کُتب بینی کے سوا دُنیا کی کسی چیز سے سروکار نہ ہو، جو اپنی بات بے دھڑک کسی خوف و خطر کے بغیر کہہ دیتا ہو ۔ نہ لالچ سے مجبور ہو نہ دباؤ میں آتا ہو ۔ ایسے انسان کو ماڈرن درویش ہی کہا جاسکتا ہے ۔ استاد، فیض احمد فیض کے بڑے مدّاح اور دوست تھے ۔ ثبوت یہ کہ فیض صاحب نے وفات پائی تو اُستاد دامن بذاتِ خود انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے ۔ لیکن اپنے دوست کو الوداع کہنے کے لیے بسترِ علالت سے اُٹھ کر ان کے گھر ماڈل ٹاؤن پہنچے اور انھیں سُپردِ خاک کرکے واپس گئے ۔ غالباً تیسرے ہی دن خود اُستاد دامن بھی انتقال فرماگئے ۔

پروفیسر امین مغل نے ان کی وضع داری کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک بار استاد کا فون آیا اور انھوں نے پروفیسر صاحب سے ملاقات کا وقت طلب کیا ۔ پروفیسر صاحب نے کہا "اُستاد کیوں شرمسار کرتے ہیں ۔ حکم کیجیے ۔ مَیں خود حاضر ہو جاؤں گا" کہنے لگے " پروفیسر صاحب کام میرا ہے اس لیے مجھ کو چل کر آپ کے پاس آنا لازم ہے" ۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد پروفیسر صاحب نے انھیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ پروفیسر صاحب کے پاس تشریف نہ لائیں ۔ اب پروفیسر صاحب ان کے حجرے میں پہنچے ۔ دیکھا کہ ایک چارپائی اور چائے بنانے کی چھوٹی تپائی کے سوا ہر جگہ کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں ۔ فرش سے چھت تک کتابیں بھری ہوئی ہیں اور اُستاد دامن نان کے ٹکڑے توڑ توڑ کر ایک کونے میں ڈال رہے ہیں ۔ پروفیسر صاحب

نے پوچھا ۔

" اُستاد یہ کیا ؟" کہنے لگے :

" پروفیسر صاحب اِس حجرے میں چوہے پیدا ہو گئے ہیں ۔ اس سے پہلے کہ وہ میری کتابیں کھائیں مَیں ان کی خوراک خود ہی انھیں پہنچا دیتا ہوں" ۔

اُستاد نے پروفیسر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ روسی زبان سیکھنا چاہتے ہیں ۔ کوئی ایسا شخص بتائیں جو روسی زبان بھی سکھا دے اور سکھانے کے پیسے بھی وصول کرے ۔ دوسری شرط خاصی مشکل تھی ۔ کوئی شخص اُستاد دامن سے معاوضہ وصول کرنے پر آمادہ نہ تھا ۔ اور استاد مفت میں پڑھنا نہیں چاہتے تھے ۔ کہتے تھے " جو علم مفت حاصل ہو جائے اس کی قدر نہیں ہوتی" ۔

خیر ۔ یہ تو جُملہ معترضہ تھا ۔ مختصر یہ کہ استاد روسی زبان نہ سیکھ سکے ۔ مگر پروفیسر امین مغل ان کے مستقل ملاقاتی ضرور ہو گئے ۔ دیکھا کہ ہر موضوع پر، ہر زبان کی کتابیں اس طرح رکھی ہوتی ہیں کہ مزید کی گنجائش نہیں ہے ۔ کتابوں کی بُہتات کا ایک سبب استاد دامن نے یہ بھی بتایا کہ کتاب رکھ کر بھُول جاتا ہوں دوبارہ اِس کتاب کی ضرورت پڑتی ہے تو اس انبار میں اسے تلاش کرنا محال ہے اِس لیے بازار سے دوسری جلد خرید لاتا ہوں ۔

اُستاد دامن نے بڑی بے خوفی سے شعر لکھے اور بہت اچھے شعر لکھے ۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھے ۔ ہر حکومت ان سے ناراض رہی اور وہ اس سے نالاں رہے ۔ ایک بار ان کی شعلہ بیانی سے بگڑ کر پولیس حرکت میں آئی اور اُستاد دامن کو گرفتار کر لیا ۔ الزام یہ تھا کہ ان کے حجرے سے بم برآمد ہُوا ہے ۔ اُستاد دامن نے عدالت میں کہا " جنابِ عالی میرا حجرہ چھوٹا تھا ورنہ پولیس تو

وہاں سے ٹینک بھی برآمد کر سکتی تھی"۔ اِس واقعے کے بارے میں انھوں نے ایک شعر بھی موزوں کیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

نہ چرس نہ شراب نہ کوئی حسینہ نکلی
شاعر کے گھر سے نکلا بھی تو بم نکلا

اُستاد کو اپنے وطن اور اپنی زمین سے پیار تھا۔ شہر تو کیا وہ تو اپنا حُجرہ تک ترک کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

لندن کے "اُردو مرکز" میں اُستاد دامن کے بارے میں یہ دلچسپ محفل کافی دیر جاری رہی اور پس منظر میں ان کے دوست فیض احمد فیض کی تصویر لگی ہوئی تھی اور ان کے اشعار بھی لکھے ہوئے تھے۔ محفل کے اختتام پر چائے کا دور چلا میں سوچتا رہا کہ مرحوم فیض صاحب اور استاد دامن مرحوم میں کتنی بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ اب نہ دوسرا فیض پیدا ہوگا اور نہ دوسرا استاد دامن۔ تو پھر ہم نے ان کے ساتھ ان کی زندگی میں جو سلوک روا رکھا ہے اس کی تلافی کیوں کر ہوگی؟

لوکیشنز کی تلاش میں

ایک بار پھر پی آئی اے کی فلائٹ پی کے ۷۰۹، کراچی سے لندن روانگی کے لیے تیار تھی۔ فلائٹ کا وقت صبح آٹھ بجے تھا۔ مسافر دو تین گھنٹے پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور امیگریشن کے جھمیلوں سے فارغ ہونے کے بعد ڈیپارچر لاؤنج میں موجود تھے۔ یہ لاؤنج ایک لمبوترا سا ہال ہے بین الاقوامی معیار کے حساب سے دیکھیں تو نہایت بدنما اور بے حیثیت غالباً نیا لاؤنج زیرِ تعمیر ہے اس سے پہلے ہم نے کراچی میں ایک اس سے بہتر لاؤنج بھی دیکھا تھا جو غالباً ڈھے گیا۔ پاکستان کے بین الاقوامی ہوائی اڈّوں کی حالت قابلِ تعریف نہیں ہے اب تو ہمارے حکّام اور افسران بھی سال میں بیسیوں پھیرے مختلف ملکوں کے لگا لیتے ہیں۔ انھوں نے کبھی ہوائی اڈوں کا معیار دوسرے ملکوں کے ہم پلّہ کرنے کے لیے سوچنا گوارا نہیں کیا۔

فلائٹ پی کے ۷۰۹، کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، ہم اور ہمارے ساتھی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ جہاز نے پرواز کے لیے رن وے پر دوڑنا شروع کیا تو کمزور دل لوگوں کے چہرے فق ہوگئے لیکن پی آئی اے کے پائلٹ جس مہارت اور نفاست سے ہوائی جہاز اُڑاتے ہیں اس کے پیشِ نظر بہت جلد مسافروں کے چہروں کی رونق واپس آگئی۔ جلدی ائیر ہوسٹسوں نے ناشتے کی فراہمی شروع کر

دی۔ مسافروں نے کھانا پینا شروع کر دیا اور کچھ دیر کے بعد سب کا اعتماد بحال ہو گیا۔ ایک پاکستانی فلم "ہم اور تم" کا یونٹ اس فلائٹ میں سفر کر رہا تھا یہ اس یونٹ کی پہلی قسط تھی۔ باقی لوگ اور اداکار بعد کی قسطوں میں آنے والے تھے۔ ہدایت کار حسن عسکری اپنی بیگم کے ساتھ مصروفِ سفر تھے۔ فلم والوں کی مصروف زندگی انھیں عام طور پر گھریلو زندگی سے دُور رکھتی ہے لیکن اس سفر میں حسن عسکری اور ان کی بیگم نے جتنا وقت ایک ساتھ گزارا غالباً پچھلے چند مہینوں میں بھی اتنا رفاقت کا لطف نہ اٹھایا ہو گا۔ حسن عسکری صاحب کے کوٹ کا بٹن ٹوٹ گیا تھا اور ان کی بیگم بٹن ٹانک رہی تھی۔ یہ گھریلو سین جو ہوائی جہاز میں رونما ہو رہا تھا بہت دلچسپ تھا۔ ہم نے عسکری صاحب کی توجّہ اس طرف مبذول کرائی تو بولے :

"یہ بٹن مجھے کم سے کم پچاس ہزار میں پڑے گا۔"

ان کا اشارہ بیگم کی ہمراہی کے اخراجات کی طرف تھا۔ سِلائی کے معاوضے اِتنے زیادہ تو دنیا میں کہیں بھی نہ ہوں گے۔

ہوائی جہاز کی پہلی منزل استنبول تھی۔ یہاں مسافروں نے لاؤنج میں اتر کر ہاتھ پیر سیدھے کیے گھومے پھرے اور کچھ خریداری بھی کی۔ مسافروں کی یہ عجیب نفسیات ہے کہ وہ ہر ائرپورٹ کی ٹیکس فری دوکانوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی آغاز سفر ہوا ہے اور آگے چل کر انھیں دنیا کے بے شمار شہر اور دوکانیں دیکھنی ہیں، مگر ان کی خریداری اور دل للچانے کا سلسلہ پہلی منزل ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ استنبول کا ائرپورٹ دُنیا کے جدید ترین ہوائی اڈّوں کا ہم پلّہ ہے (کراچی سے مقابلہ نہ کریں۔ شرمندگی ہوتی ہے) کراچی میں گرمی تھی لیکن استنبول میں ٹھنڈی ہواؤں نے خیر مقدم کیا، یہیں احساس ہو گیا کہ اب ہم ایشیا سے یورپ کی طرف سفر کر رہے ہیں سمارٹ عورتیں اور مرد دوکانوں اور ائرپورٹ کے مختلف شعبوں میں مامور تھے۔ ترک

یوں بھی پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں اور اظہار محبت کا ذرا سا موقع بھی ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ پاکستانی بھی ترکوں کے عاشق ہیں اور ان کی محبت اور اخلاص پر فخر کرتے ہیں۔ خلوص اور محبت کے یہ مظاہرے مختصر قیام کے دوران میں بارہا نظر آتے۔

استنبول میں قیام خاصا طویل ہو گیا۔ وہاں جو مسافر اُترے تھے اِتنے ہی دوبارہ جہاز میں سوار ہو گئے۔ ہوائی جہاز پھر کھچا کھچ بھر گیا۔ اس بار جہاز کا عملہ بدلا ہُوا تھا۔ استنبول میں عملے کا تبادلہ عمل میں آیا اور چند ہی لمحے بعد مسافروں کی خدمت میں کھانا پیش کیا جانے لگا۔ ہم نے دُنیا کی اور بھی ائرلائنز پر سفر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کھلانے پلانے کے معاملے میں جس قدر شیر پی آئی اے والے ہیں، دوسرے اس کے عشر عشیر بھی نہیں اور پھر کھانا بھی بہت لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے چنانچہ مسافروں کو استنبول میں انتظار کی جو زحمت اُٹھانی پڑی تھی اس کا مداوا "پیا" نے کھانے سے کر دیا۔ پی آئی اے کی فلائٹ بھی بہت اچھّی ہے کھانا بھی بہت لذیذ ہوتا ہے، ہمیں ذاتی طور پر اگر کسی چیز پر اعتراض ہے تو وہ ہوسٹس خواتین کے اعلانات پر ہے۔ انگریزی کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ہے لیکن اردو میں اعلانات جس طرح زبان کو توڑ مروڑ کر کیے جاتے ہیں ان کا سبب آج تک سمجھ میں نہیں آیا اور پھر لہجہ بھی ایسا جیسے کوئی فرینچ خاتون اُردو بولنے کی کوشش کر رہی ہوں، نہ اسے آپ اردو کہہ سکتے ہیں نہ انگریزی، سخت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کسی ایک فلائٹ تک محدود نہیں ہے پی آئی اے کی تمام اناؤنسرز نے یہی لب و لہجہ اپنا لیا ہے۔ جس طرح ٹی وی کے اداکاروں اور اناؤنسروں کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے اسی طرح پی آئی اے کی اناؤنسرز کا بھی ایک علیحدہ اندازِ بیان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی صاحب انھیں یہ کیوں نہیں سمجھاتے کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو

کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ گوروں کے انداز میں اعلانات کر کے ہماری اناؤنسرز
آخر ظاہر کیا کرنا چاہتی ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ خاتون (کوئی بھی
خاتون) کوئی اعلان کرتی ہیں تو لب و لہجے کو مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ ادائیگی کا ایسا
انداز اختیار کرتی ہے جیسے کوئی رومانی گفتگو فرما رہی ہوں۔

بہرحال استنبول سے ایمسٹرڈیم تک کی پرواز پھر بہت خوب تھی۔ ایمسٹرڈیم
پر مختصر قیام کے بعد اب جو طیارہ روانہ ہوا تو ایک خاص بات یہ ہوئی کہ وہ انگریز
مسافر جو استنبول تک نہایت شرافت اور مقبولیت کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے اچانک
"رواں" ہوگئے۔ انھوں نے زور زور سے قہقہے بلند کرنے شروع کر دیئے اور پھر بلند
آوازوں سے گانے بھی گائے، پتہ چلا کہ استنبول میں ان کے ہاتھ "دخترِ رز" آگئی
تھی، بوتل ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ آپس میں باری باری بوتل کو منہ لگاتے اور دوسرے
مسافروں کا سکون برباد کرتے رہے۔ پی آئی اے کی فلائیٹ پر شراب کی بندش ہے۔
بے زبان مسافر بار بار پی آئی اے کے عملے کی طرف دیکھ رہے تھے جو اپنے بدتہذیب
مسافروں کی حرکتوں کو نہایت خوش دلی سے نظر انداز کرتے رہے۔ ہم لوگوں کو اپنے
"گامے ماجھوں" کی حرکتوں پر بہت ندامت ہوتی ہے لیکن یقین کیجئے کہ استنبول
سے لندن تک جو بدتمیزیاں یہ مہذب انگریز کرتے رہے کاش انگریزوں کا سر بھی
اس پر شرم سے جھک جاتے مگر ایسا ذرا ہونا مشکل ہے اس لیے کہ دوسری قومیں اتنی
جلدی نادم ہو کر سر جھکانے کی عادی نہیں ہیں جتنے کہ ہم ہیں۔

ایمسٹرڈیم میں سردی نے زیادہ رنگ دکھایا، بارش بھی ہو رہی تھی اور ٹھنڈی
ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ ائرپورٹ لاؤنج میں ہیٹر چل رہے تھے جس سے اندازہ ہو
گیا کہ لندن کا موسم کیسا ہوگا۔

لندن کا ائرپورٹ حسبِ معمول جانا بوجھا اور مانوس نظر آیا، سردی خاصی تھی،

ٹھنڈی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور آسمان پر گھرے بادل تھے مگر چھوڑیئے
ان باتوں کو، پہلا مرحلہ تو امیگریشن کا تھا، مجھے لندن آتے جاتے ہوئے کئی سال گزر
گئے ہیں اب تو امیگریشن والے یہ بھی سوال نہیں کرتے کہ کتنے عرصے ٹھہرنے کا ارادہ
ہے یا آپ کے پاس پیسے بھی موجود ہیں یا نہیں! البتہ فلم یونٹ کے بعض حضرات ایسے
تھے جو نہ صرف پہلی بار لندن آتے تھے بلکہ ان کے پاسپورٹ بھی "تازہ دم" تھے یعنی
ایک تو نوجوان اور صحت مند آدمی اس پر لندن پر پہلا حملہ اور پھر پاسپورٹ بھی
نیا نکور۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ بعض حضرات اپنی قومی زبان کے علاوہ دوسری کوئی
زبان نہیں بول سکتے تھے۔ ہم نے امیگریشن والوں کو یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی لندن
میں رواج یہ ہے کہ مسافر باری باری ایک وقت میں صرف ایک (ایک ہی خاندان
کی صورت میں تمام خاندان) امیگریشن کی میز کے سامنے پہنچتا ہے۔ ہمارے حصے میں
جو صاحب آئے وہ نوجوان اور خوش مزاج تھے، باریش بھی تھے۔ ہمیں انھوں نے
جھٹ پٹ فارغ کر دیا اور پھر جب ہم نے انھیں دوسرے ساتھیوں کی مشکل کے
بارے میں بتایا تو انھوں نے دوسری میزوں پر بھی جا کر انھیں صورت حال سے مطلع
کرنے کی کوشش کی۔

لندن ائرپورٹ پر اب یہ آسانی (یا پریشانی) مہیا کر دی گئی ہے کہ ایشیائی مسافروں
کا انٹرویو ان کی زبان میں ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجابیوں سے ٹھیٹ پنجابی میں سوالات
کیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے پنجابی خواتین و حضرات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔
ہمیں تو امیگریشن کی سرحد عبور کرا دی گئی مگر دوسرے حضرات سے سوالات شروع ہو
گئے۔ بدقسمتی سے بعض حضرات کے جوابات ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے مگر ہم
نے یہ دیکھا کہ انگریز بہت معاملہ فہم اور قیافہ شناس قوم ہے۔ تمام تر غلطیوں کے باوجود
امیگریشن والوں کو یہ احساس تھا کہ یہ لوگ واقعی فلم یونٹ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ

کچھ دیر کی ردّ و قدح کے بعد یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا۔

اِس اثناء میں ہم نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو چند اور لوگ بھی مبتلائے پریشانی نظر آئے مثلاً ایک صاحب جو کسی برطانوی خاتون کے منگیتر تھے پاکستان سے آتے تھے اور ان سے ایک انگریز جرح کر رہا تھا۔ بھئی اس زمانے میں کوئی دولہا یا دُلہن شرم خاک کرے گا جب اس سے ایسے ایسے بے شرمی کے سوالات کیے جائیں گے۔ ہم ائرپورٹ سے چلے آئے، پتہ نہیں بعد میں ان منگیتر صاحب پر کیا گزری ؟۔

لندن عجیب و غریب شہر ہے۔ کلاسیکی راگ کی طرح یہ رفتہ رفتہ آپ پر اثر کرتا ہے اور پھر سارے وجود میں رچ بس جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح لوگ کہتے ہیں کہ صاحب "لہور، لہور اے" اِسی طرح لوگ کہتے ہیں کہ صاحب لندن کی کیا بات ہے ؟ جس کسی کو ایک بار لندن کی رنگینیاں اور رعنائیاں بھا جائیں پھر وہ اس شہر کے سحر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یوں تو دُنیا میں اور بھی بڑے بڑے اور خوبصورت شہر ہیں۔ پیرس ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص کے دو وطن ہیں ایک اس کا اپنا وطن اور دوسرا پیرس۔ خوب صورتی اور دلکشی میں بھی یہ شہر بے مثال ہے۔ اس کی رنگینیاں اور دلفریبیاں اپنی جگہ مگر لندن میں دلوں کو موہ لینے والی جو بات ہے وہ پیرس میں کہاں ہے! شاید ایک وجہ لندن کا ماحول اور زبان بھی ہے۔ یورپ کے شہر میں ہم خود کو اجنبی اور بے زبان محسوس کرتے ہیں، زبان جُدا۔ دُکانوں کے بورڈ ناقابلِ فہم، سڑکوں کے نام مشکل، راستوں کے نشانات اور ہدایات مختلف، لوگوں کی شکلیں اور عادتیں نامانوس، بھلا ایسے شہر میں کوئی اپنے آپ کو مسافر اور اجنبی محسوس نہ کرے تو کیوں نہ کرے ؟ جب کہ لندن میں سڑکیں جانی پہچانی لگتی ہیں۔ برّصغیر کے عام بڑے شہروں کو انگریزوں نے اِسی طرز پر تعمیر کیا تھا پھر سڑکوں کے نام جانے بوجھے۔ انگریزی زبان تو خیر ہے ہی ہماری اپنی زبان، خود اپنے ملک میں ہم اسی زبان کا سہارا لیتے ہیں، یہ تو آپ جانتے

ہیں کہ ہمارے مُلک میں جو ٹریفک کے قواعد ہیں وہ یہی انگریز بنا کر گئے ہیں۔ سڑکوں پر روڈ سائن وہی، سوائے اس کے کہ ان پر عمل درآمد ذرا سختی سے کرایا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قدم پر ہندوستانی پاکستانی چہرے نظر آجاتے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ لندن میں کوئی جگہ، کوئی دکان، کوئی سڑک ایسی نہیں ہے جہاں اردو اور ہندوستانی یا پنجابی زبان سُنائی نہ دے۔ بعض علاقوں پر تو اپنے مُلک کا گمان گزرتا ہے اب بتلایئے جہاں اتنی "خوبیاں" ہوں تو وہ شہر آپ کے دل میں کیوں نہ اُتر جائے ؟

لندن اِن دنوں بہت ٹھنڈا ہے یہاں کے موسم کا یوں تو کبھی بھی اعتبار نہیں ہوتا مگر ان دنوں یہ غیر مستقل مزاجی ذرا زیادہ ہے۔ گھڑی میں دھوپ چمک رہی ہے، گھڑی میں گھرے بادل، ٹھنڈی ہوائیں اور بارش، اس موسم سرما میں انگلستان میں خوب سردی پڑی ہے۔ لندن میں سالہا سال کے بعد برف باری ہوئی۔ اپریل کے وسط میں عام طور پر انگلستان میں موسم بہار کی آمد ہو جاتی ہے لیکن اِس بار سردیاں زیادہ لمبی ہو گئی ہیں۔ درخت سوکھے، ٹُنڈ مُنڈ، گھاس میں وہ بات نہیں جو موسم بہار کی آمد پر ہو جاتی ہے۔ یہاں وہاں پھُول البتّہ نظر آجاتے ہیں۔ مگر بہت کم، گویا جس بہار کی امیّد لے کر لندن آئے تھے وہ ابھی دُور ہے۔ لندن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ چاہے جتنے عرصے بعد لندن آئیں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہو گی یوں لگے گا جیسے ابھی آپ یہاں سے گئے تھے۔ وہی سڑکیں، وہی بازار، وہی عمارتیں، قدامت پسندی تو اس قوم کا طرّہ امتیاز ہے نا۔ اور روایت پسندی میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

جس فِلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہم یہاں آئے ہیں اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مناسب اور موزوں مقامات شوٹنگ کے لیے تلاش کیے جائیں۔ لندن شہر سے زیادہ دوسرے مقامات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مناسب لوکیشنز کی تلاش کا آغاز ہو گیا۔

انگلستان کے شمالی علاقے میں "لیک ڈسٹرکٹ" واقع ہے۔ یہ علاقہ سکاٹ لینڈ

کے نزدیک ہے اور اپنی خوب صورتی کے اعتبار سے قابلِ دید۔ وہ تو آپ نے سُنا ہوگا کہ کشمیر کے بارے میں مغل بادشاہ نے کہا کہ اگر دُنیا میں کہیں جنّت ہے تو یہی ہے مگر دُنیا کے اور بھی بہت سے علاقوں میں اللہ تعالیٰ نے جنّت کے نمونے بنا رکھے ہیں۔ انگلستان کا لیک ڈسٹرکٹ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی بہت سی جھیلیں ہیں، خوش نما مناظر اور سبزہ زار ہیں، کھیت ہیں، باغات اور جنگلات ہیں۔ ایک تو قدرت نے فیّاضی سے کام لیا ہے۔ اِس پر انسانوں کی ہُنرمندی نے مزید چاند لگا دیئے ہیں۔ جگہ جگہ پرانے لارڈز کے قلعے اور محلات ہیں جن میں سے بیشتر اب سیّاحوں اور عوام کے دیکھنے کے لیے کھول دیئے گئے ہیں۔ ہم نے بھی ایسے لارڈز کے بارے میں بہت سُنا اور پڑھا تھا مگر اس بار بالمشافہ دیکھنے اور ملنے کا موقعہ ملا۔

بذریعہ کار لندن سے روانہ ہوتے تو پہلی منزل "بلیک پُول" تھی یہ ساحلی شہر ہے اور اتنا ہی دلکش اور دلفریب ہے جتنے کہ یورپ کے ساحلی شہر ہوا کرتے ہیں۔ ان دنوں سردی زیادہ ہے اور سیّاحوں کا موسم بھی شروع نہیں ہوا اس لیے بلیک پول میں وہ رونق نظر نہیں آتی جو چند ہفتے بعد ہو جاتے گی۔ ایک تو سردی اوپر سے یخ بستہ ہوائیں اتنی تیز کہ کھڑا ہونا دشوار، ہمیں کسی نے پاکستان میں یہ غلط خبر سنائی تھی کہ لندن میں موسم گرما شروع ہو چکا ہے۔ مگر یہاں تو انگریز گرم کپڑوں میں لپٹے ہوتے سردی سے سُکڑتے پھر رہے ہیں تو پھر بھلا ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔

ونڈر میئر جھیل لیک ڈسٹرکٹ کی بہت خوبصورت اور خاصی طویل جھیل ہے۔ اسی نام کا شہر بھی ہے۔ مختصر لیکن بہت خوبصورت، ہوٹلوں کی بہتات ہے اور ہوٹل ہمارے پاکستانی حساب سے نہایت اچھّے اور نسبتاً کافی ارزاں۔ خیر یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں ہوٹل غالباً ساری دُنیا کے ہوٹلوں سے زیادہ مہنگے ہیں۔ کیا یورپ کیا امریکہ کیا ایشیاء اور کیا مشرق بعید، یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ملک میں ہوٹلوں

کے کرایوں اور معیار کی نگرانی کے لیے کوئی ادارہ ہی موجود نہیں ہے یا اگر کوئی ادارہ ہے بھی تو اس سے تعلّق رکھنے والے حضرات کو شاید یہ علم ہی نہیں ہے کہ دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوٹل ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں؟ ورنہ پست معیاری اور گرانی کیوں ہوتی؟

ہم ونڈر میئر کے جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے یہ جھیل کے سامنے ہے منظر نہایت خوش نما، جس کمرے میں ہم مقیم تھے اس کی کھڑکی سے جھیل کا ناقابلِ فراموش منظر نظر آرہا تھا، کمرے میں پوسٹر بیڈ تھا۔ فرنیچر نہایت اعلیٰ درجے کا ٹی وی اور تپلون استری کرنے کا اہتمام کمرے میں موجود اور غسل خانہ؟ غسل خانہ اِتنا وسیع اور خوبصورت کہ کیا بتائیں۔ اچھّے خاصے کمرے کے سائز کا غسل خانہ تھا جس میں ایک حوض نما ٹب، اِس ٹب میں ہم جیسے اناڑی پیراکی بھی کر سکتے ہیں بلکہ اناڑی پن کی وجہ سے ڈوب بھی سکتے ہیں۔ اِس کمرے کا کرایہ سُن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ اِس لیے ہم آپ کو حیران نہیں کرنا چاہتے اور اس کرائے میں صبح کا ناشتہ بھی شامل تھا اور ناشتہ بھی مکمل انگریزی ناشتہ جو ہم جیسے کم خوروں کے دو وقت کے کھانوں کے برابر ہوتا ہے۔

نہایت لمبا سفر کر کے اور بے شمار جھیلیں اور مناظر دیکھنے کے بعد ہم اس ہوٹل میں داخل ہوتے تو جی خوش ہو گیا۔ نہ صرف آرائش دیکھ کر بلکہ ہال میں ایک طرف آتشدان میں لکڑیوں کی آگ روشن دیکھی سارا ہال اس کی تمازت سے خوشگوار ہو گیا تھا ہماری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آتی کہ یہاں کی ہمّت شکن مہنگائی کے باوجود اتنے شاندار ہوٹل اور بہترین خدمات فراہم کرنے کے بعد اتنے کم کرائے وصول کر کے یہ لوگ کیوں کر زندہ رہتے ہیں؟ اور ان ہوٹلوں کا عملہ اس قدر خوش مزاج اور مہمان نواز کیوں کر ہوتا ہے؟ شاید موسم کا اثر ہے!! رات کو کھانے کے لیے ایک اور ہوٹل میں گئے۔ یہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ شاندار، ڈائننگ ہال میں ہمارے لیے

میز مخصوص تھی۔ کھانے کی قیمت چھ پونڈ فی عدد اور کھانا بھی تین کورس کا مکمل ڈنر۔ سُوپ، سویٹ اور کافی سمیت۔ اتنے شاندار ہوٹل میں اتنے متواضع عملے کی خدمات سے لُطف اندوز ہوتے ہوتے اتنا اچّھا اور اتنا سستا کھانا بھلا کہاں دستیاب ہو گا اور یہ حال اس وقت جب انگریز گرانی کے مارے "ہائے مرگئے ہائے مرگئے" چلّا رہے ہیں۔

لیک ڈسٹرکٹ لنکاشائر کے علاقے میں واقع ہے۔ شمالی انگلستان کا یہ خطّہ جنّت نظیر کہا جاسکتا ہے۔ قدرت نے خوب صورتی اور دلکشی نہایت فیّاضی کے ساتھ عطا کی ہے۔ سبزہ زار، جھیلیں، خوب صورت مناظر، کہیں کہیں حدّ نظر تک تناور درختوں کے ذخیرے، ابھی موسم نے پوری طرح دامن نہیں سمیٹا اور یہ علاقے تو یوں بھی انگلستان کے سرد ترین علاقے سمجھے جاتے ہیں۔ اس بار یہاں سردی معمول سے زیادہ پڑی اور خزاں کا موسم کچھ زیادہ طویل ہوگیا یہی وجہ ہے کہ میدانوں میں تو سبزے نے ڈیرے جما لیے لیکن درختوں کے جسم ابھی تک پتّوں سے محروم ہیں۔ خشک ٹُنڈ مُنڈ درختوں کا اپنا حُسن ہوتا ہے، بلکہ بادلوں اور دُھند کے ساتھ پتّوں سے محروم کچھ زیادہ ہی بھلے لگتے ہیں۔ انگریزوں کو یہ موسم اور سماں شاید ناگوار گزر رہا ہو گا لیکن ہم جیسے نووارد سیّاحوں کے نزدیک یہ موسم اور منظر عجیب دلکشی کا حامل ہے۔ موسم کا یہ عالم کہ دھوپ کبھی کبھی چمکتی ہے مگر زیادہ تر ابر چھایا رہتا ہے۔ کبھی گھرے بادل آجاتے ہیں اور پھوار پڑنے لگتی ہے اور کبھی دھواں دھار بارش۔ ہم کیونکہ مناسب گرم کپڑے ساتھ نہیں لاتے تھے اس لیے سردی اور بارش کی شدّت ہمیں پریشان کرتی رہی۔ ایسے ٹھنڈے اور نم موسم میں بھلا ایک معمولی سوٹ کس کام آسکتا ہے؟

آج آس پاس کے شاہی محلّات اور باغات دیکھنے کا پروگرام تھا لیکن جب ہوٹل سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ دھوپ اپنا مختصر سا جلوہ دکھا کر غائب ہو چکی ہے

ابر آلودہ آسمان اور سرد تیز ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ مزید ستم یہ ہے کچھ دیر بعد بارش بھی شروع ہوگئی، پہلے ایک قریبی جزیرے میں جانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ جزیرہ جسے بیل آئی لینڈ کہا جاتا ہے ایک لارڈ کی ملکیت ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جانے کے لیے بوٹ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں ہے۔

جاوید ملک صاحب نے ایک دن پہلے جائیداد کے مینجر سے فون کے ذریعہ ملاقات کا وقت لے لیا تھا اور انہوں نے ساڑھے دس بجے موٹر بوٹ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم دس بجے جھیل پر پہنچ گئے ایک طرف ونڈر میئر کا خوبصورت قصبہ اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر بنے ہوئے خوش نما ہوٹلوں اور مکانوں کی سفید عمارتیں چمک رہی تھیں دوسری طرف جزیرے کا منظر تھا۔ سبزے اور درختوں کی آمیزش کچھ عجیب ہی سماں پیدا کر رہی تھیں، اس جزیرے میں لارڈ کے محل کے علاوہ اور کوئی عمارت موجود نہیں ہے۔ اس محل کی خوبی یہ ہے کہ یہ گولائی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ انگلستان کی تاریخ کا پہلا گول محل ہے جو سولہ سو عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا، اس اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے ہم لوگ (میں جاوید ملک اور ہدایت، کار عسکری صاحب اور ان کی بیگم) جھیل کے پتّن پر کھڑے موٹر بوٹ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی دوسری کشتی ہمیں اس جزیرے میں نہیں لے جاسکتی تھی، یہ کیونکہ ذاتی رہائش گاہ ہے اس لیے اجازت کے بغیر کوئی اس جزیرے پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ ساڑھے دس بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ جزیرے کی طرف سے ایک مختصر موٹر بوٹ نمودار ہوئی۔ جاوید ملک نے مطلع کیا کہ یقیناً یہ کشتی ہمیں لینے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ موٹر بوٹ کنارے سے آکر لگی اور اس میں سے ایک لڑکا بھیگتا ہوا باہر نکلا۔ ان صاحب نے ایک فضول سی گرم برساتی اور جینز پہن رکھی تھی ہمیں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ہم ہی ان کے منتظر ہیں۔ موٹر بوٹ پانی میں بھیگی ہوئی تھی۔ لکڑی کی نشستیں پانی سے شرابور تھیں۔ اس لیے مجبوراً انہی پر بیٹھنا پڑا اور

کشتی بان نے کشتی کا رُخ جزیرے کی طرف موڑ دیا۔ عسکری صاحب ہمیں اِرد گرد کے مناظر کی خوبصورتی کی طرف متوجّہ کرتے رہے مگر سردی اور جھیل میں پانی کی اُٹھتی ہوئی موجوں کی وجہ سے ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم تیرنا نہیں جانتے اس لیے گہرے پانی سے ڈرتے ہیں۔ عسکری صاحب ہمیں تسلّی دینے کے لیے بولے "فکر نہ کیجیے۔ ہم چاروں میں سے تیرنا کوئی نہیں جانتا" اور اگر جانتے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔ جھیل کے یخ بستہ پانی میں کتنی دیر تیر لیتے؟ بات معقول تھی اِس لیے ہم دل پر جبر کرکے بیٹھے رہے۔ کشتی بان سے ہم لوگ مختصر سفر کے دوران جزیرے کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ ہم سب اس کو ملازم سمجھ رہے تھے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس پھٹیچر حُلیے میں یہ صاحب دراصل لارڈ کے صاحبزادے ہیں۔ بہت حیرت ہوئی، ہمارے مُلک میں تو معمولی لوگوں کے بیٹے بھی اس "حُلیے" میں رہنا اور ایسے گرے پڑے کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

جزیرے پر پہنچ کر فرزند لارڈ نے موٹر بوٹ روک دی، اور ہم لوگ چھلانگیں لگا کر کشتی سے باہر نکلے اور جزیرے پر قدم رنجہ فرمایا، کشتی بان ہمیں چھوڑ کر رُخصت ہو گئے اور ہم لوگوں نے جزیرے کی خوش نمائی سے لُطف اندوز ہوتے ہوتے گول قصر کی طرف قدم بڑھائے، چند قدم چلے تو سامنے ایک درخت پر نمایاں عبادت نظر آئی "کُتّوں سے ہوشیار رہیے"، اب حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ہی کُتّوں سے ڈرتے ہیں محاورے کے مطابق جو کُتّے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں ہیں مگر بقول مرحوم پطرس بخاری کون جانے کہ یہ کُتّا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔ عسکری صاحب اور ان کی بیگم تو وہیں رُک گئے مگر ہم نے دلاسہ دیا کہ بھائی محض ڈرانے کے لیے یہ بورڈ لگا دیا ہوگا۔ بعض لوگ نفسیاتی طور پر رُعب ڈالنے کے لیے کُتّوں سے خبردار کرنے کا بورڈ لگا دیتے ہیں۔ ہم پاکستان میں بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جن کے کُتّوں کو

مَرے ہوئے بھی سالہا سال گزر چکے ہیں۔ مگر "کُتّے سے خبردار رہیے" کا بورڈ انھوں نے اپنے گھروں میں لگایا ہوا ہے اور بہت سے لوگ محض بورڈ پڑھ کر ہی کنّی کاٹ جاتے ہیں اور گھر کی چار دیواری میں قدم رکھنے کی جرآت نہیں کرتے۔ بیگم عسکری نے کچھ ہمّت بڑھائی اور ہم سب نے محل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ مگر کچھ فاصلے پر عسکری صاحب کو پھر "کُتّے سے خبردار رہنے" کا بورڈ نظر آیا تو ان کا قدم زمین پر جم کر رہ گیا۔ اِس بار انھوں نے ہم سب کی توجہ اِس نکتے کی طرف مبذول کرائی کہ کُتّے سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جاوید ملک صاحب کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے کُتّے نہایت مہذّب اور با اخلاق ہوتے ہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر عسکری صاحب اور ان کی بیگم کا خیال تھا کہ کُتّا تو بس کُتّا ہوتا ہے۔ انگریزی اور دیسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ عسکری صاحب اور ان کی بیگم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

ہم گومگو کے عالم میں تھے، کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی رُک جاتے تھے مگر جاوید صاحب ہم لوگوں کی بزدلی پر ہنستے ہوئے محل کی طرف رواں دواں تھے۔ اسی وقت محل کی گول عمارت سے ایک صاحب سوٹ اور کوٹ پہنے ہوئے برآمد ہوئے، یہ اس جاگیر کے مینیجر تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر جاوید صاحب سے ہاتھ ملایا، انھیں نمودار ہوتے ہوتے دیکھا تو عسکری صاحب بھی معہ بیگم کے آگے آئے، تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر براؤن نے ہمارے عجیب و غریب حُلیے کو بغور دیکھا اور پھر عسکری صاحب کی بیگم پر نظر ڈالی جو شلوار قمیض میں ملبوس تھیں۔ اوپر سے انھوں نے گرم سیاہ شال لپیٹی ہوئی تھی جو تیز ہوا کی وجہ سے سنبھالنی دشوار تھی۔ تعارف کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ محل کی طرف سے دو کُتّے نمودار ہوئے۔ ایک کافی بلند و بالا اور نہایت خطرناک شکل کا تھا اور دوسرا مختصر سا، ہم لوگوں کی تو جان نکل گئی مگر مسٹر براؤن کی موجودگی غنیمت

تھی۔ کُتّوں نے ہمارے نزدیک آکر مہمانوں کو گھورا اور پھر خونخوار شکل والا کُتّا آگے بڑھ کر غالباً ہم سب سے مزید متعارف ہونے کی غرض سے ہمیں سونگھنے لگا۔ ہماری تو جان ہی نکلی جا رہی تھی مگر عسکری صاحب کی بیگم کی تو چیخ بھی نکل گئی۔ کُتّے کو یہ آواز پسند نہیں آئی اور اس نے غصّے سے غرّانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ ہماری طرف آتا اور ہمیں چکھنے کی کوشش کرتا اور کبھی جاوید صاحب کو سونگھنے لگتا، خوف کے مارے ہم سب کا بُرا حال تھا۔ مسٹر براؤن کی حرکت ملاحظہ فرمایئے کہ بجائے کُتّے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے دبی زبان میں ہمیں مشورہ دینے لگے " حرکت مت کیجئے خاموش کھڑے رہیئے۔ بالکل مت ڈریئے" خیر حرکت تو ہم ویسے بھی نہیں کر رہے تھے۔ سب کے سب بُت بن کر رہ گئے تھے۔ اب کُتّے نے غُرّانے کے ساتھ ساتھ دانت بھی نکالنے شروع کر دیئے اور اس کی شہ پر چھوٹا کُتّا بھی اُچھل کود کرنے لگا۔ مسٹر براؤن کے دل میں اللہ نے نیکی ڈالی اور انھوں نے کُتّے کا پٹّہ تھام کر نہایت نرمی سے اپنے ساتھ آنے کی ہدایت کی، وہ چلا تو گیا مگر مُڑ مُڑ کر ہمیں گھورتا اور خفا ہوتا رہا۔ چھوٹا کُتّا ابھی تک وہیں کھڑا جمناسٹک کر رہا تھا مگر ہم سب کی توجہ بڑے کُتّے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد مسٹر براؤن نے اس کو کہیں لے جا کر باندھ دیا اور مسکراتے ہوئے واپس آئے ہم نے چھوٹے کُتّے کی طرف اشارہ کیا تو بولے ارے اس سے کیا ڈرنا۔ یہ تو بلّی کے برابر ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ کُتّے کے خوف سے نجات ملی تو ہم سب کی جان میں جان آئی اور ہم نے مسٹر براؤن کی سرکردگی میں محل کی عمارت کا رُخ کیا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت لیڈی صاحبہ کچھ مہمانوں کی تواضع میں مصروف ہیں اِس لیے ان سے ملاقات ممکن نہ ہو گی۔ اتنی دیر میں ہم لوگ محل کی گول بالکونی کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مسٹر براؤن معذرت کرتے ہوئے اندر جانے لگے تو ہم نے مشورہ دیا کہ کُتّے کو بھی ازراہِ کرم ساتھ ہی لے جائیں۔ وہ

مُسکراتے اور بولے "ارے یہ؟ یہ بلّی کے برابر ہے اِس سے کیا ڈرنا؟" اور یہ کہہ کر عمارت کے اندر غائب ہو گئے۔ ادھر بالکونی میں مسٹر براؤن لیڈی صاحبہ کی معیت میں نمودار ہوئے۔ لیڈی صاحبہ خوبصورت بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھیں اور سر سے پیر تک فیشن کی تصویر بنی ہوئی تھیں عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ، صورت شکل سے بھی لیڈی ہی نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے مسکرا کر ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا اور بولیں کُتّوں کی بدتمیزی پر معذرت خواہ ہیں۔ جاوید صاحب نے محل کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو بولیں کہ اس وقت تو کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں پھر کبھی سہی۔ "مگر ہم تو لندن واپس چلے جائیں گے" ابھی یہ سلسلہ گفتگو جاری ہی تھا کہ دُور سے کسی کُتّے کے بھونکنے کی خوفناک آواز سُنائی دی اور ہم بے اختیار سیڑھیوں کو طے کر کے بالکونی پر پہنچ گئے۔ لیڈی صاحبہ نے پہلے تو حیرت کے ساتھ اور پھر دلچسپی سے ہم لوگوں کو دیکھا۔ مسٹر براؤن غالباً انھیں کُتّے کی بداخلاقی کا حال پہلے ہی سُنا چکے تھے اور وہ جان گئی تھیں کہ یہ لوگ کُتّوں کے عادی نہیں ہیں۔ بہرحال انھوں نے صورت حال کو بھانپ لیا اور مُسکرا کر بولیں "آپ لوگ اندر تشریف لے آیئے۔ مگر مَیں زیادہ دیر آپ کی میزبانی نہ کر سکوں گی۔" ان کی سرکردگی میں ہم لوگ گول محل کے اندر داخل ہوئے۔ چھوٹا کُتّا شاید ہم سے زیادہ محل دیکھنے کا مشتاق تھا چنانچہ وہ کود کر ہم سے پہلے اندر پہنچ گیا اور نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ دُم ہلا کر ہمیں خیر مقدم کہنے لگا۔ یہ بھی شاید لیڈی صاحبہ کی صحبت کا اثر تھا ورنہ اس کی گستاخیاں ہم کچھ دیر پہلے دیکھ چکے تھے۔

باہر کی یخ بستہ ہواؤں اور خوف و خطر کی فضاؤں کے بعد محل کے اندر کا ماحول نہایت دوستانہ اور خوشگوار تھا۔ ہم جس راہداری میں داخل ہوئے وہ حقیقتاً کسی محل کی راہداری نظر آ رہی تھی۔ قیمتی قالین، ریشمی پردے، پُرشکوہ فرنیچر، دیواروں پر

نادر و نایاب، پینٹنگز، چھتوں پر بڑے بڑے فانوس، گیلریاں، بلند و بالا دروازے اور کھڑکیاں، غرضیکہ وہ سبھی کچھ تھا جو کسی لارڈ کے محل میں ہونا چاہیئے۔ لیڈی صاحبہ ہمارے آگے آگے ہر کمرے کے بارے میں بتاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ چند لمحے بعد ہم ہال کمرے میں داخل ہوئے تو اس کمرے کی آرائش اور زیبائش دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ یاد آ گیا، ہال میں چند حضرات اور خواتین موجود تھیں۔ خواتین قیمتی فیشن ایبل لباسوں میں اور حضرات مکمّل انگریزی لباس میں، ایک صاحب جن سے تعارف کرایا گیا خود بھی لارڈ تھے مگر نہایت خوش مزاج اور با اخلاق کھڑے کھڑے تعارف کی رسم ادا ہوئی اور ہم لوگوں نے لیڈی صاحبہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم اس خوبصورت اور تاریخی محل میں اپنی فلم کی شوٹنگ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ فلموں کا تذکرہ نکلا تو جاوید ملک صاحب نے باتوں باتوں میں بتایا کہ ہم لوگ اس سے پہلے انگلینڈ میں ایک اور فلم "پلے بوائے" بنا چکے ہیں یہ سُنتے ہی کمرے میں ایک لمحے کے لیے سنّاٹا چھا گیا خواتین نے لمبی "اوہ" کی اور مردوں نے کھنکارنا شروع کر دیا، ہم سمجھ گئے کہ اس لارڈانہ ماحول میں "پلے بوائے" کا لفظ مناسب نہ تھا۔ "پلے بوائے" میگزین اپنی شہرت کے لیے دُنیا بھر میں بدنام ہے اور اس کا نام آتے ہی اس سے وابستہ روایات یاد آنے لگتی ہیں۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ "پلے بوائے" فلم کا رسالہ "پلے بوائے" سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ لارڈ نے یکایک بلند آواز سے ہنسنا شروع کر دیا ان کی دیکھا دیکھی لیڈی صاحبہ بھی قہقہے لگانے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مہمانوں کے قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ "پلے بوائے" واقعی؟ لارڈ صاحب نے ہنسی سے بے تاب ہو کر کہا اور پھر ہنسنے لگے مجبوراً ہم لوگوں کو بھی ان سب کے ساتھ ہنسی میں شامل ہونا پڑا ورنہ بد تہذیبی سمجھی جاتی کچھ دیر بعد جب قہقہوں کا شور کم ہوا تو ہم نے وضاحت پیش کی کہ "پلے بوائے" فلم کا رسالہ "پلے

بوائے" کی شہرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بالکل مختلف قسم کی فلم ہے۔ بمشکل انھیں یقین آیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے نہایت کڑی شرطیں لگا دیں اور اس محل میں شوٹنگ کرنا ہمارے لیے ممکن نہ رہا۔ دراصل بات یہ تھی کہ انھیں اپنے کُتّوں کے بے آرام ہونے کا ڈر تھا۔ دوسری طرف ہم بھی اُن خونخوار کُتّوں سے ڈرے ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی

لندن کے بلیکیے

"اے پیسیج ٹو انڈیا" پچھلے دنوں لندن میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈیانا کے علاوہ شاہی خاندان کے دوسرے لوگ بھی اس فلم کے پریمیئر کے موقع پر موجود تھے۔ ہم ان دنوں لندن میں نہیں تھے۔ لیکن فلم دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ای ایم فارسٹر کا ڈرامہ اور ڈیوڈ لین کی ہدایت کاری ظاہر ہے لندن میں جو فلمیں دیکھی تھیں ان میں سرفہرست یہی فلم تھی۔

آغاز میں یہی فلم چیدہ چیدہ سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ ہم دوسرے ہفتے دیکھنے کے لیے پہنچے مگر پتہ چلا کہ اگلے ہفتے سے پہلے کوئی ٹکٹ نہیں ہے مجبوراً واپس آگئے۔ لیکن سینما آنے جانے میں ہمارا پرس گم ہو گیا۔ جس میں نقد رقم کے علاوہ دوسرے ضروری کاغذات، ٹیلی فون کی نوٹ بک اور ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ تلاش کے باوجود پرس نہ مل سکا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ فلم ہمیں کافی مہنگی پڑی۔

دوسرے ہفتے یہ فلم لندن کے دوسرے تمام علاقوں میں بھی نمائش کے لیے پیش کر دی گئی۔ جمعہ کی شام کو ہم شیفٹ بری ایونیو کے ایک سینما میں فلم دیکھنے گئے۔ اس کی طوالت زیادہ ہے اس لیے ہر روز صرف دو شو ہوتے ہیں۔ سینما گھر کے سامنے خاصا ہجوم تھا جسے دیکھ کر ہم پھر مایوس ہو گئے۔ اداکار افضال اور ان کے کم سن بھتیجے فیصل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ فیصل کو ڈیوڈ لین کی فلم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سائنس فکشن دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے آدھے ووٹ کے مقابلے میں "پیسیج ٹو انڈیا" کے حق میں دو ووٹ تھے۔ اکثریت کی رائے کے سامنے بے چارے فیصل نے سر جھکا دیا۔ بھئی آخر ہم ایک ایسے ملک میں تھے جو جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ٹکٹ سب فروخت ہو چکے ہیں۔ فیصل کی تو دلی مراد بر آئی۔ مگر ہم نے ایک سوٹڈ بوٹڈ انگریز کو دیکھا جو چند ٹکٹ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور نہایت شگفتہ انگریزی میں دریافت کر رہا تھا کہ آپ کو ٹکٹ تو نہیں چاہیے؟

ہم سمجھے شاید یہ صاحب کسی وجہ سے فلم دیکھنے کا ارادہ بدل چکے ہیں۔ افضال صاحب خوشی خوشی ان کے پاس گئے۔ انھوں نے پوچھا:

"کتنے ٹکٹ چاہئیں؟"

"ڈھائی، دو پورے، ایک آدھا"

انگریز نے سر سے پیر تک انھیں دیکھا، پھر فیصل پر نظر ڈالی اور بولا:

"آدھا ٹکٹ نہیں ہوتا"

فیصل بولے:

"مگر میرا تو ہوائی جہاز میں بھی آدھا ٹکٹ لگا ہے"

بحث بیکار تھی ہم تین ٹکٹ خریدنے کو تیار ہو گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ ساڑھے چار پونڈ کا ٹکٹ ساڑھے سات پونڈ میں ملے گا۔ لندن میں یہ ٹکٹوں کی بلیک کا پہلا واقعہ تھا جو ہمیں پیش آیا۔ مگر افضال صاحب بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔

"تین ٹکٹ پندرہ پونڈز"

"ٹوئنٹی پونڈز"

اتنی دیر میں ایک عدد خاتون ہانپتی کانپتی آگئیں اور ساڑھے سات پونڈ میں

ایک ٹکٹ لینے پر آمادہ ہوگئیں۔ ہم نے افضال صاحب کو اشارہ کیا کہ مان لو ورنہ اس سے بھی جائیں گے۔ لیجئے صاحب اس سوٹیڈ بوٹیڈ انگریز نے سینما کے بالکل سامنے، کھُلّم کھُلّا ہمیں بلیک میں ٹکٹ فروخت کر دیئے۔ فیصل نے چپکے سے کان میں کہا:

"چچا پولیس والے سے کہہ کر اسے پکڑوا دیجئے۔"

مگر ہم کو تو فلم دیکھنے کی دھن تھی۔ اور پھر یہ بھی خبر نہیں کہ لندن میں ٹکٹوں کی بلیک کوئی جرم بھی ہے یا نہیں۔ انگریز بلیک مارکیٹئے نے ہم سے کہا:

"جلدی جائیے، سائیڈ پروگرام چل رہا ہے۔"

سینما ہال میں داخل ہوئے، سائیڈ پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ فلم کے ٹائیٹلز شروع ہو چکے تھے جیسا کہ شاید آپ کو علم ہوگا یہ فلم اٹھارویں صدی کے آخری زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک انگریز خاتون مسز مور اپنے بیٹے سے ملنے اور ہندوستان دیکھنے کے لیے انگلستان سے روانہ ہو رہی ہیں جو وہاں ایک ضلع میں سٹی مجسٹریٹ ہے۔ ان کے بیٹے کی منگیتر بھی سیر کی غرض سے اور منگیتر سے ملنے کے لیے ان کے ہمراہ ہیں۔ جس بحری جہاز میں وہ سفر کر رہی ہیں، اسی میں ہندوستان کے وائسرائے بھی جا رہے ہیں۔ اس دَور کا لندن تو ہم نے پہلے بھی فلموں میں دیکھا ہے مگر ڈیوڈ لین نے اس عہد کے ہندوستان کا نقشہ بھی دکھا دیا اور بہت حد تک حقیقت سے قریب۔

فلم نے آغاز ہی سے توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ افضال صاحب فلم میں کھوتے ہوتے تھے مگر سگریٹ کی طلب بھی ستا رہی تھی۔ انھوں نے جھٹ ایک سگریٹ سلگائی۔ اب رواج یہ ہے کہ یہاں سینما گھروں میں "تمباکو نوشی منع ہے۔" قسم کی کوئی ہدایت نہیں لکھی ہوتی۔ ہر سیٹ کے ساتھ ایش ٹرے بھی لگی ہوتی ہے۔ مگر لوگ بہت

کم سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ کوئی اِکّا دُکّا آدمی سگریٹ سے شوق فرماتا ہے اور وہ بھی بہت احتیاط سے۔ افضال صاحب نے یہ کیا کہ سگریٹ کو خاص پاکستانی اسٹائل میں مُٹھی میں دبایا اور لگے کش پر کش لینے۔ جب تک انھوں نے تین سگریٹ ختم کیے آس پاس کا علاقہ دھواں دھار ہو چکا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ فلم کی خوبیوں کی داد بھی بلند آواز دیتے جا رہے تھے۔ بہرحال سگریٹ کے بعد ہم نے ان سے درخواست کی کہ اب وہ فی الحال سگریٹ نہ سُلگائیں۔ فلم بھی بڑے دلچسپ اور نازک مرحلے میں داخل ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ بلاپس وپیش مان گئے۔

اِس فلم کا اسٹیج پلے کئی سال پہلے دُنیا بھر میں دکھایا جا چکا ہے اور اُس وقت بھی ڈرامے کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور داد ملی تھی۔ اِس فلم کا مرکزی کردار دراصل ایک ہندوستانی ڈاکٹر عزیز ہے، ڈرامے میں یہ کردار پاکستان کے ضیاء محی الدین نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے اَدا کیا تھا اور نقّادوں سے داد وصول کی تھی۔ فلم میں یہ کردار ایک ہندوستانی برنجی نے اَدا کیا اور اچّھا ہی کیا ہے، مگر ضیاء محی الدین والی بات نہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر کے ہندوستان کا نقشہ ڈیوڈ لین نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا اب انگلستان سے ہندوستان آنے والے سرکاری ملازم ملک کے ماحول سے مانوس ہو چکے تھے اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں اس کا رویّہ بدل چکا تھا۔ بہت سے کلبوں وغیرہ میں ہندوستانیوں کا داخلہ بند تھا۔ انگریز حاکم دیسی لوگوں کو کمتر سمجھنے لگے تھے۔ اگرچہ کوئی کوئی ٹوٹی پھوٹی اُردو بھی بولتا تھا مگر وہ زمانہ گزر چکا تھا جب انگریز ہندوستان میں اُردو اور فارسی لکھنا اور بولنا ضروری سمجھتے تھے۔

"اے پیسیج ٹو انڈیا" ایک گہری رومانی فلم بھی ہے۔ اگرچہ ایک بھی رومانی منظر

یا مکالمہ ساری فلم میں موجود نہیں ہے) اور اس کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ انصاف پسند اور جمہوریت نواز انگریز انتقامی جذبے کا شکار ہو کر کس طرح انصاف کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈاکٹر عزیز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بے چارے ایک انگریز سٹی مجسٹریٹ کی منگیتر کو تاریخی مقامات دکھانے کے لیے لے گئے مگر ایک حادثے کی وجہ سے سٹی مجسٹریٹ کے عتاب میں آ گئے۔ گرفتار ہوتے، مقدمہ چلا، وہ تو کہیے خیر ہوئی کہ منگیتر نے عدالت میں سچ بول دیا اور ڈاکٹر عزیز کو رہائی مل گئی۔ اس دوران میں "انڈیا چھوڑ دو" کے نعرے بھی بلند ہوتے۔ مقامی آبادی نے ڈاکٹر عزیز کی حمایت میں جلوس نکالے۔ عدالت پر دھاوا بول دیا۔ بہرحال انگریزی انصاف کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

یہ نہیں کہ سبھی انگریز کردار کے متعصب تھے۔ مسز مور ایک بہت کشادہ دل اور رحمدل خاتون تھیں۔ ایک مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر فیلڈنگ کا کردار بھی بہت خوب ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہے اور ڈاکٹر عزیز کی حمایت میں سارے انگریز افسروں کی مخالفت مول لیتا ہے۔ سب سے موثر اور خوبصورت کردار منگیتر کا ہے۔ فلم کی کہانی بیان کر کے کہانی کا تجسس ختم نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک اسٹیج پلے کو ڈیوڈ لین نے بہت خوبصورتی اور ہنرمندی سے فلم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ (بہترین معاون اداکارہ کے آسکر ایوارڈ کے سوا) یہ فلم کوئی آسکر ایوارڈ حاصل نہ کر سکی۔ مگر فلم کے ہر فریم اور ہر منظر پر ڈیوڈ لین کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اداکاری کا معیار بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن شاید ضیا محی الدین ڈاکٹر عزیز کے کردار کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر انصاف کرتے۔

انگریز حاکموں کی جانب داری کے مناظر سینما ہال میں بیٹھے ہوئے انگریز تماشائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ یوں بھی اب یہ ایک گزری ہوئی داستان ہے۔ قصہ پارینہ حقیقت سے زیادہ خواب لگتا ہے۔

اس فلم کی نمائش نے بھارت کو ایک بار پھر پبلسٹی دے دی ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے لیے کئی مناظر اور ماحول موجود ہیں۔ اس فلم کی ایک خاص بات اس کا جذباتی تاثر ہے۔ ایک بھارتی اور پاکستانی فلم کی طرح یہ دیکھنے والوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے مغربی تماشائیوں کو فلم کی یہی جذباتیت پسند نہ آئی ہو۔ مگر موضوع کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت فلم ہے۔ اپنے نام کے باوجود اس فلم کو "گاندھی" جیسا قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ نہ ایوارڈ کی بارش ہوئی۔ حالانکہ بطور فلم ایک بہتر فلم ہے۔

فلم دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلے تو پکاڈلی سرکس کے علاقے میں "ہرے راما ہرے کرشنا" کا جاپ کرتے ہوئے ایک مختصر سا گروہ جا رہا تھا۔ ہندو لباسوں اور چغوں میں انگریز مرد اور عورتیں سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یہ تحریک اب بہت پرانی ہو چکی ہے اور مقامی آبادی اور سیاحوں کو بھی اب اس نظارے میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن آج سے پندرہ سولہ سال پہلے اس کا بہت زور شور تھا اور ان دنوں لندن کی سڑکوں پر چوٹیوں والے انگریز، جلیبو گلے میں ڈالے اور دھوتیاں پہنے، اسی لباس میں لپٹی ہوئی انگریز لڑکیوں کے ساتھ "ہرے کرشنا ہرے راما" کے نعرے لگاتے ہوئے اکثر نظر آیا کرتے تھے۔ اب نعروں میں بھی وہ زور نہیں رہا اور شاید اس کی دلکشی بھی کم ہو چکی ہے مگر پے در پے چند فلموں کی نمائش نے بھارت میں دنیا بھر کے لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فلم کا ذریعہ کتنا مؤثر ہے۔

اس فلم میں ایک ہندو پنڈت پروفیسر کا کردار نامور برٹش اداکار سر ایلک گنس نے بھی ادا کیا ہے۔ مختصر کردار ہے مگر گیٹ اپ اور میک اپ کے علاوہ اپنی اداکاری

کے ذریعہ ایلک گینس نے اسے ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے۔ اس کردار کی خوبصورتی یہ ہے کہ مکالمے برائے نام ادا کیے ہیں مگر تاثرات کے ذریعہ سبھی کچھ کہہ گئے ہیں۔

قصّہ پُرانے کیسل کا

ایک فلم "ہم اور تم" کی شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آتے ہیں جس کی تمام تر فلم بندی یورپ میں ہوگی۔ سلمیٰ آغا اور جاوید شیخ اس فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے دوسرے اداکاروں میں ننّھا اور افضال شامل ہیں جب کہ باقی اداکار انگلستان ہی سے لیے گئے ہیں۔ یہ ایک رومانی اور میوزیکل کہانی ہے جس میں وہ تمام لوازمات بھی موجود ہیں جو ہماری فلموں میں ضروری ہوتے ہیں۔ پس منظر یورپ اور انگلستان کا ہے اور تمام تر کہانی اسی پس منظر میں شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہوجاتی ہے۔ اسے آپ ایک "لو اسٹوری" بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہماری تو ساری ہی فلمیں "لو اسٹوری" ہوتی ہیں۔ ایک لڑکا ہے، ایک لڑکی ہے، آپس میں پیار کرتے ہیں، راستے میں زمانے اور سماج کی دیواریں حائل ہوجاتی ہیں، مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فلم کے اختتام پر اکثر یہ مل جاتے ہیں اور کبھی کبھار یہ بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ مل جائیں تو اسے "ہیپی اینڈنگ" کہا جاتا ہے اور ہمارے تماشائیوں کی بہت بڑی اکثریت خوشی کا انجام ہی پسند کرتی ہے چاہے درمیانی عرصے میں کتنی ہی پریشانیاں اور مصیبتیں نازل ہوں اور رو رو کر دیکھنے والے (خصوصاً خواتین) ہلکان ہوجائیں۔ کبھی کبھی المناک اختتام بھی تماشائیوں کو پسند آجاتا ہے بشرطیکہ ان کے دل کو لگ جائے۔ اس کہانی کے درمیان میں ناچ گانے، ڈرامہ،

لڑائی مارکٹائی، آنسو، خوشیاں، ملنا، بچھڑنا اور پھر ملنا۔ گولیاں، پولیس، ڈاکو، غنڈے
اسمگلر یہ سب بوقتِ ضرورت آتے جاتے رہتے ہیں اور ہمارے تماشائیوں کے دل بہلانے
کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ بہرحال آپ اسے ایک لو اسٹوری کہہ سکتے ہیں۔ کہہ لیجیے
ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اب قصّہ یہ ہے کہ فلم کی ہیروئن ایک بہت دولت مند باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی
ہے، باقی سب کو چھوڑیئے۔ پہلی مشکل تو یہ پیدا ہوتی کہ انگلستان میں رہنے والے ایک
دولت مند باپ کو کیسا ہونا چاہیئے اور اس کی لاڈلی منہ چڑھی بیٹی کیسی ہوگی؟ ظاہر ہے
یہ محل نُما مکان میں رہتے ہوں گے، قیمتی چمک دار کاریں چلاتے ہوں گے، نوکر چاکر ہوں گے،
ذاتی ہوائی جہاز ہوں گے، ذاتی بجرہ ہوگا۔ گویا سارا تام جھام جو کسی انگریز دولت مند کے
پاس ہونا چاہیئے، ایک پاکستانی فلم جو ایک محدود سرمائے سے بنائی جاتی ہے اس کے لیے
یہ سارا سامان فراہم کرنا خاصا مشکل ہے۔

پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اس دولت مند ہیروئن کی شایانِ شان دوسری چیزوں کے
علاوہ مکان تلاش کیا جائے۔ اب ہم آپ کو اس مکان کی تلاش کا قصّہ سناتے ہیں۔
انگلستان اور یورپ کے عام اور متوسّط طبقے کے لوگ جن گھروں میں رہتے ہیں وہ
گنجائش کے لحاظ سے ہمارے دس مرلے کے گھروں سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اچھے
خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی چھوٹے گھروں اور فلیٹوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ بہت
زیادہ دولت مند اور خاندانی رئیسوں نے اپنے لیے پُرشکوہ محل نما مکان اور کیسل بنائے۔
ہمیں ایسے ہی کیسل کی ضرورت تھی جس کی کھوج میں سب لگے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کیسل
لارڈز کی ملکیت ہوتے ہیں۔ جن کی اکثریت اب غریب ہو چکی ہے اور انھوں نے اپنے
محل فروخت کر دیئے ہیں یا نمائش گاہ اور میوزیم بنا دیئے ہیں یا پھر انھیں ہوٹلوں میں
تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جن لارڈز کو اللہ نے ابھی تک روپے پیسے سے نوازا ہے وہ اب

بھی اپنے کیسل میں رہتے ہیں۔ اِس قسم کے کسی لارڈز سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی
رہائش گاہ میں کسی کو شوٹنگ کی اجازت دے دے گا اور وہ بھی کسی پاکستانی فلم
ساز کو، ایں خیال است و جنوں والا معاملہ ہے چنانچہ اس سلسلے میں تو مکمل ناکامی
ہوئی۔ اب رہ گئے وہ کیسل جو نمائش گاہ بن چکے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں بھی سیّاحوں
اور دیکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے بھلا وہاں کب اور کیسے فلم کی شوٹنگ ہو
سکتی ہے؟ پھر بھی مَیں نے اور ہدایت کار حسن عسکری نے کئی کیسل دیکھے جو انگلستان
کے دور دراز علاقوں میں واقع ہیں اور واقعی قابلِ دید ہیں۔ ان کی عمارتیں۔ ان کا
فرنیچر۔ آس پاس کے باغات۔ قیمتی قالین۔ قدیم نوادرات اور تصاویر۔ قابلِ دید
فانوس، سبھی کچھ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ کیسل بیشمار ایکڑ سبزہ زاروں
درختوں، باغوں اور جھیلوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ بھئی واہ کیا ٹھاٹ سے یہ لارڈز
رہتے ہوں گے، ہمارے پُرانے رئیسوں کی حویلیاں تو ان کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔
ان مقامات پر فلم بندی کی اجازت نہ مل سکی اور اگر کوئی لارڈ صاحب رضامند بھی
ہوتے (ان عجائب گھر نما مکانوں کی دیکھ بھال اور نگرانی پُرانے لارڈز بذاتِ خود
کرتے ہیں) تو ایسی شرطیں عائد کر دیں کہ جن کا پورا کرنا ناممکن۔ مثلاً مقرّرہ گھنٹوں میں
کام ہوگا۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا، صفائی کا خیال رکھا جائے گا، سگریٹ
کی راکھ تک فرش پر نہیں گرائی جائے گی۔ منتخب اور معدودے چند افراد ہی عمارت
کے اندر داخل ہو سکیں گے، شور و غل بالکل نہ ہوگا، سیّاحوں کو ڈسٹرب نہیں کیا
جائے گا، پالتو کُتّوں کے مزاج اور عادات کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی جائے گی
(ان کے مزاج اور عادات کو جاننے کے لیے بھی ہفتے درکار ہیں) کرایہ بہت زیادہ
ہوگا، باقاعدہ تحریری معاہدہ کرنا ہوگا معاہدے کو قانونی مشیر ترتیب دیں گے جن کی فیس
الگ ہوگی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ عمارت میں شوٹنگ کرنے کے لیے بھاری انشورنس کرانی

ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ تو شاید مذکورہ بالا شرائط سُن کر ہی گھبرا گئے ہوں گے۔ ان حالات میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ باقی لارڈ بہتر ہے کہ آپ اتنی لمبی چوڑی تقریر کرنے کی بجائے صرف ایک لفظ "سوری" کہہ کر اپنی اور ہماری مشکل آسان کر دیں۔

اب دوسری قسم کے محل باقی رہ گئے جو ہوٹلوں میں تبدیل کر دیتے گئے ہیں۔ انگلستان میں جو انگریز منتظم اعلیٰ ہماری پروڈکشن کے انتظامات کے ذمّہ دار ہیں ان کا نام ڈیو ہے (پیو کے وزن پر دیو نہ سمجھ لیجئے گا) مگر کام کرنے کے معاملے میں، وہ دیو سے کم نہیں ہیں۔ آخرکار انھوں نے ایسے ہوٹلوں کی فہرست تیار کر لی جو ہمارے کام بھی آسکتے تھے اور جن کے منتظمین نے فلم بندی کا نام سُنتے ہی "نو سوری" نہیں کہا تھا۔ لیجئے اب ہم ایک ایسے ہی ہوٹل کا رُخ کر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل انگلستان کے اندرونی علاقے ڈیون شائر کے اندرونی قصبے شیلڈن کے ایک اندرونی خطّے میں واقع ہے، ابھی یہاں سیاحوں کا موسم شروع نہیں ہوا اِس لیے مہمان بہت کم ہیں۔ مئی کے آخری ہفتے سے مہمانوں کی بھرمار ہو جاتی ہے گی اِس لیے فی الحال وہاں فلم بندی کی اجازت ملنے کا امکان ہے بشرطیکہ . . . .

کار سبزہ زاروں پہاڑیوں اور اونچی نیچی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس ہوٹل کی طرف جا رہی ہے۔ سڑک پتلی ہے مگر ہر جگہ ٹریفک کے سائن موجود ہیں۔ دور دراز گاؤں کی پختہ اور صاف سڑک کے دونوں طرف خوبصورتی سے تراشی ہوئی باڑھ بھی ہے۔ ہوٹل کے بورڈ کو دیکھ کر دروازے میں داخل ہوتے۔ دُور تک لمبی سڑک سبزے اور درختوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ہوٹل کی عمارت نظر آتی۔ یہ اینٹوں اور پتھروں کی بنی ہوئی قدیم خوبصورت عمارت ہے۔ آس پاس میدان اور باغ ایک سمت گہرائی میں دریا بہہ رہا ہے، بہت دلفریب منظر ہے۔ مسٹر ڈیو نے آخری منٹ پھر ہدایات دیں کہ یہ صاحب پُرانے ٹائپ کے ہیں اِس لیے ان سے کیا کہنا چاہیئے اور کیا نہیں

کہنا چاہیئے ورنہ . . . .

ہوٹل کا دروازہ قدیم لکڑی کا ہے جس پر لوہے کا کُنڈا لگا ہوا ہے۔ ہم نے کُنڈا دو تین بار دروازے پر مار کر بجایا۔

"بس بس بس"۔

ڈیو صاحب بھاگے ہوتے آتے۔

"ایک ہی بار دستک دینا کافی ہے، وہ بُرا مان جائیں گے"!

چند لمحے بعد دروازہ کھلا، سامنے ایک انگریز کھڑے تھے۔ سُوٹ بُوٹ پہنے ہوتے سر سے ننگے۔ دُور سے دیکھنے پر ۲۵ سال کے نظر آتے تھے، قریب سے دیکھو تو چالیس بیالیس سال کے لگتے تھے مگر دراصل ان کی عمر ۶۵ سال ہے۔ چھوٹے قد کے پُھرتیلے آدمی ہیں، بال قدرتی بھورے ہیں۔ انگریزوں کے بالوں سے ان کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کتنی کم عمر لڑکوں لڑکیوں کے بال سفید اور بھُورے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا چور بدن ہے یعنی دُبلے نظر آتے ہیں مگر صحت مند ہوتے ہیں ان صاحب کو کہہ سکتے ہیں کہ "چور" عمر کے ہیں۔ دیکھنے میں کچھ اور دراصل عمر کچھ اور۔

خیر۔ ان سے تعارف ہوا۔ بہت رسمی انداز میں۔ انھوں نے باقاعدہ سب سے مصافحہ کیا اور اخلاقاً تبسم بھی کیا، نام ان کا مسٹر کنگ ہے۔ ان کے باپ دادا اس محل کے مالک اور لارڈ تھے۔ اب یہ ہوٹل چلاتے ہیں۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ والی بات ہے۔ یعنی یہ ان کی بیگم اور ان کی صاحبزادی اس ہوٹل کا کُل اسٹاف ہے۔ مسٹر کنگ بہت گاڑھی انگریزی بول رہے تھے جیسے چھان پھٹک کر چند مطلب کے الفاظ ہم لوگوں کے پلّے پڑ جاتے تھے۔ عمارت کے اندر گئے تو خوبصورت لاؤنج۔ قدیم قالینوں اور فرنیچر سے سجا ہوا۔ دیواروں پر تلواریں اور خنجر لگے ہوتے (آرائش کے لیے) لکڑی

کی پیچ دار سیڑھیاں اُوپر جاتی ہوتی، ایک طرف قدیم قیمتی فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ رُوم۔ دوسری طرف ایک کمرہ جس کو بار بنا یا گیا ہے، تیسری طرف باورچی خانہ، چوتھی طرف کچھ اور کمرے، یہ نچلی منزل تھی، اُوپر کی منزل پر دس بارہ کمرے، بس اس ہوٹل میں اس سے زیادہ مہمان نہیں ٹھہر سکتے گویا ڈبل رُوم ہوں تو چوبیس پچیس مہمان۔ ہدایت کار حسن عسکری نے ہوٹل کے ایک دو کمرے شوٹنگ کے لیے پسند کیے اور ہم سب لاؤنج میں آکر کاروباری بات چیت کی غرض سے بیٹھ گئے باہر سخت سردی اور کُہر تھی۔ مگر کیا مجال جو مسٹر کنگ نے جھوٹے منہ بھی چائے کے لیے پوچھا ہو۔ اچھّے خاندانی رئیس ہیں۔ مگر یہ انگریز ایسے ہی سرد مہر ہوتے ہیں، ہمارا ملک ہوتا اور کوئی فقیر بھی ہوتا تو چائے، دودھ، لسّی سے خاطر کرتا اور پلائے بغیر نہ چھوڑتا۔ مگر یہ ٹھہرے انگریز، جب ان سے پیسے اَدا کر کے چائے طلب کی گئی تو انھوں نے بہت اخلاق سے معذرت کی اور کہا کہ مسز اس وقت حساب کر رہی ہیں، چائے چار بجے سے پہلے نہیں مل سکتی۔ لیجیے قِصّہ ختم ہُوا۔

مسٹر کنگ خالص انگریز آدمی نکلے۔ بلکہ آدمی بھی کیا محض انگریز۔ انھیں دو دن کی شوٹنگ کی اجازت کے لیے حوالے اور سفارشی خطوط درکار تھے۔ ضمانت چاہیے تھی۔ نقد بھی اور کسی ادارے کی بھی۔ خیر کافی دیر تک بات چیت رہی۔ انھیں مناسب حوالے اور سفارشیں فراہم کی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ ان لوگوں سے تصدیق کرنے کے بعد اجازت دیں گے۔ بات چیت جاری تھی مگر ہمیں کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خرّاٹے لے رہا ہے۔ پہلے تو اپنا واہمہ خیال کیا مگر کچھ دیر بعد خرّاٹے بلند ہو گئے اور عجیب دردناک قسم کے خرّاٹے تھے۔ ہم حیران کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ سب لوگ سامنے موجود ہیں اور جاگ رہے ہیں، پھر جاگتے میں خرّاٹے کون لے سکتا ہے؟ اور وہ بھی ایسے خوفناک۔ پھر سوچا کہیں اس پُرانے گھر پر آسیب کا اثر نہ ہو۔ مگر کچھ دیر بعد پرابلم حل ہو گئی۔ خرّاٹے

لینے والا مسٹر کنگ کا کُتّا تھا جو دوسرے کمرے میں ایک صوفے پر سو رہا تھا۔ کُتّا تو اس کا نام تھا۔ سائز میں کراچی کے کسی گدھے سے ہرگز کم نہیں ہو گا۔ فرق صرف یہ کہ اس کُتّے کے بال زیادہ لمبے تھے اور سفید تھے۔ انگریز کُتّا جو ہوا۔ اس کُتّے کی دوسری خوبی یہ بتائی گئی کہ بے چارہ اندھا ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ ٹٹول بھی نہیں سکتا۔ صرف سُونگھ کر راستہ تلاش کرتا ہے۔ بعد میں بھی جب شرفِ ملاقات حاصل ہوا ہم نے اسے سوتے اور خرّاٹے لیتے ہوتے ہی پایا۔ خدا جانے کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا سوتا ہی رہتا ہے؟

مسٹر کنگ سے ہم نے پوچھا کہ صاحب آپ اتنی حفاظت اور ضمانت طلبی کیوں کرتے ہیں، کہنے لگے۔ یہ پانچ سو سال پُرانا گھر ہے، ہر چیز قدیم ہے اور اب تو نوادرات میں شمار ہوتی ہے۔

یہ میز دیکھیے۔ یہ کُرسیاں دیکھیے۔ یہ ڈنڈا دیکھیے۔ یہ آتش دان دیکھیے بلکہ آگ کُریدنے والا لوہے کا یہ چمٹا دیکھیے۔ ہم نے سب چیزیں غور سے دیکھیں۔ چمٹے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بولے یہ چمٹا فلاں بادشاہ نے ہمارے فلاں رشتے دار کو دیا تھا۔ اس کی قیمت ہزاروں میں ہے۔ پھر وہ اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے رہے کہ انگلستان کا قدیم تہذیبی سرمایہ اور نوادرات امریکن اور دوسرے دولت مند لوگ مہنگے داموں خرید کر لے جا رہے ہیں۔ انگلستان تو کنگال ہو رہا ہے۔ ہم نے سوچا کنگال تو ہونا تھا۔ ساری نوآبادیاں ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔ اب تو اپنے دست و بازو پر گزارا ہے۔ مگر ان کا مطلب یہ تھا کہ تہذیبی ورثے سے بھی محروم ہو رہا ہے۔ ہم نے ان کو تسلّی دینے کے لیے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اُٹھانے والی چیزیں ہی تو لوگ لے جائیں گے، عمارتیں تو یہیں رہیں گی نا۔"

انھوں نے تلخی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ پچھلے دنوں ایک ارب پتی امریکی کم بخت نے ایک کیسل خریدا اور اسے توڑ کر اپنے ملک لے گیا۔ اب وہاں اسے دوبارہ اس نے تعمیر کر لیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ غصّے سے پیچ و تاب کھانے لگے۔ واقعی، ہم نے سوچا، یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ اگر عمارتیں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ذرا غور فرمایئے کہ لندن کی بگ بین، پارلیمنٹ ہاؤس اور بکنگھم پیلس اگر کسی دن آپ کو نیویارک، کیلی فورنیا یا کویت میں نظر آ گئے تو کیا غضب ہوگا۔ اور انگریز کے دل پر کیا گزرے گی؟

ہمارے پاس مسٹر کنگ کو دینے کے لیے لفظی تسلیوں کے سوا اور کیا تھا۔ انھوں نے خوش ہو کر ہمارا تعارف اپنی بیوی اور بیٹی سے کرایا۔ ہم نے دیکھا کہ بیوی سے ڈرتے ہیں۔ وہ ان پر حاوی ہیں۔ بیٹی بھی ماں باپ کی طرح خالص انگریز۔ کیا مجال جو مسکراہٹ چہرے پر آ جاتے۔ اور الفاظ تو ایسے ناپ تول کر استعمال کرتی ہیں۔ جیسے حکیم لوگ خاندانی نسخوں میں دوائیاں استعمال کرتے ہیں۔ رتی بھر کا اضافہ ہو گیا تو سمجھو مریض گیا جان سے۔ سب سے آخر میں ہم نے درخواست کی کہ ہمیں کُتّے صاحب سے بھی ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ یہ سُن کر سارا خاندان سوچ میں پڑ گیا۔ آخر مسٹر کنگ بولے کہ جناب یہ اس کے آرام کا وقت ہے۔ ہم نے کہا۔

"وہ تو ظاہر ہے ہم اس کے خرّاٹے سُن رہے ہیں۔"

کہنے لگے۔

"بھئی اب تو یہی رہ گیا ہے اس کے پاس۔ نہ دیکھ سکتا ہے نہ بھونکتا ہے۔"

"کیا آنکھیں کمزور ہیں۔" ایک صاحب نے ہمدردی سے پوچھا۔

بولے "کاش ایسا ہی ہوتا تو ہم اس کو عینک پہنا دیتے۔ مگر وہ تو بالکل اندھا ہو چکا ہے۔"

"مگر بھونکتا کیوں نہیں۔ کیا آنکھوں کے ساتھ گویائی سے بھی محروم ہو گیا"؟ کہنے لگے۔

"جی نہیں، دراصل وہ بلاوجہ بھونکنے کا قائل نہیں۔ جب تک کوئی قابلِ اعتراض چیز اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے بھونکنا فضول سمجھتا ہے۔ اب کیونکہ دیکھ ہی نہیں سکتا اس لیے تصدیق کے بغیر بھونکنا اس کا مسلک نہیں ہے۔"
واقعی۔ کُتّا ہو تو ایسا با اصول ورنہ بہتر ہے کہ انسان آدمی ہی بن جاتے۔

باغوں کا شہر!

لندن کو باغوں کا شہر کہتے ہیں۔ دُنیا بھر میں یہ اپنے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ باغوں کا شہر تو اپنا لاہور بھی ہے۔ کسی زمانے میں لاہور میں بھی بہت سے باغ تھے۔ ان کی نگہداشت بھی خوب ہُوا کرتی تھی۔ مگر پھر امتداد زمانہ اور ایل ڈی اے نے مل جُل کر ان گلستانوں کو صحراؤں میں تبدیل کر دیا۔ کچھ باغات بے اعتنائی اور غفلت کا شکار ہو گئے۔ کچھ کو سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اور تو اور ایل ڈی اے نے تو لاہور کو خوبصورت بنانے کی غرض سے بے شمار قدیم خوبصورت سایہ دار درخت بھی کاٹ کر پھینک دیئے۔ حالانکہ ہمارے مُلک کا تو موسم بھی ایسا ہے کہ گھنے سایہ دار درخت ہماری ضرورت ہیں۔ سایہ دار درخت لگانے کی توفیق تو ہوتی نہیں، جو موجود تھے، انھیں بھی سڑکوں کی خوبصورتی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہی حال سبزے کے تختوں کا بھی ہوا۔ اب یہ دیکھئے کہ یورپ میں بارشیں اتنی ہوتی ہیں کہ سبزہ زار خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر گرمی کی وہ شدت بھی نہیں کہ انسان اور حیوان سایہ دار جگہیں تلاش کرتے پھریں۔ اس کے باوجود یہاں درختوں کی کثرت ہے۔ سڑکوں پر، بازاروں میں، گلیوں میں ہر جگہ اونچے اونچے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ پھر لوگوں کو ان درختوں سے محبت بھی اتنی ہے جیسے اپنے گھر والوں سے ہوتی ہے۔ کبھی ایسے دن بھی آتے

ہیں جب یہاں متواتر کئی ہفتے تیز دھوپ نکلتی ہے اور بارش نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں درختوں کو سیراب کرنے اور نہلانے کے لیے خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر محکمے کی طرف غفلت ہو تو لوگ گردن ناپتے ہیں۔ ایسے ہی ایک گرم و خشک موسم میں ایک صاحب نے باغات اور درختوں کے محکمے کو فون کیا اور کہا۔

"مَیں دیکھ رہا ہوں کہ دو دن سے میرے درخت کو نہلایا نہیں گیا۔ اس پر گرد و غبار چھایا ہُوا ہے"، یہاں گرد و غبار نہیں ہوتا۔ درخت تو کیا یہاں تو انسانوں کو ہفتوں نہانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور درختوں اور باغوں کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم درختوں کو کاٹ کر جلا لیتے ہیں۔ پتے بکریاں چر جاتی ہیں۔ شاخیں بچّے لٹک لٹک کر توڑ دیتے ہیں۔ رہے نئے کاشت کیے جانے والے پودے تو ان بے چاروں کا تو نوزائیدگی کے عالم ہی میں انتقال ہو جاتا ہے۔

مگر ایک بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ پچھلے چند سالوں میں کم از کم لاہور میں پرانے باغوں کی دیکھ بھال اور نئے باغ لگانے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں نئے نئے، وسیع اور خوبصورت باغ لگائے جا رہے ہیں۔ پُرانے باغوں پر بھی نظر کرم ہوئی ہے۔ دیکھئے یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے۔ لیکن اب اتنا ضرور ہے کہ ہم دوبارہ لاہور کو باغوں کا شہر کہہ سکتے ہیں۔

مَیں لندن کے باغوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یُوں تو اس گنجان آباد اور غدّار شہر میں جگہ جگہ سبزہ زار اور چھوٹے چھوٹے باغ موجود ہیں جن کی وجہ سے شہر کھُلا کھُلا اور تازہ دم لگتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لندن اپنے باغات پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے مغرب کے لوگوں نے اپنا نظریہ حیات بنا لیا ہے کہ وہ ہر چیز کا ٹیکنیکل اور افادی پہلو ضرور مدّنظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر باغوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ لندن کے باغ محض نظاروں ہی

کو تازگی نہیں بخشتے، ان کی اپنی مخصوص افادیت بھی ہے۔ یعنی خوبصورتی بھی اور پُرکاری بھی۔ لندن کا مشہور ترین اور غالباً حسین ترین باغ "کیو گارڈن" ہے۔ انگریزوں کو فخر ہے کہ ایسا باغ دُنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ یہ باغ ۲۸۸ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہُوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپ، افریقہ، ایشیا کا کوئی ایسا پودا اور درخت نہیں ہے جو اس باغ میں موجود نہ ہو۔ نظر فریب اور خوبصورت درختوں اور پھولوں کے علاوہ یہ باغ نباتات کا ایک بہت بڑا مرکز بھی ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں اقسام کے درخت اور پودوں کے علاوہ کئی لاکھ سوکھے ہوتے پودے اور جڑی بوٹیاں بھی موجود ہیں جن کو حفاظت سے رکھنے کے لیے ایئر کنڈیشنڈ شیشے کے گھر بنائے گئے ہیں۔ ان گھروں میں تمام سال درجہ حرارت وہی رکھا جاتا ہے جو پودے کے لیے لازمی ہے۔ یہی نہیں، دُنیا بھر سے ہر سال ہزاروں نت نئے درخت، پودے، پھُول اور جڑی بوٹیاں بھی یہاں لائی جاتی ہیں۔ دُنیا میں نباتات کی جتنی بھی قسمیں موجود ہیں، ایک دعوے کے مطابق وہ لندن کے "کیو گارڈن" میں موجود ہیں۔ پھر یہاں نباتات کے بارے میں مضامین اور معلومات پر مشتمل ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں نادر اور قدیم کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔ کسی بھی موضوع کا نام لیجیے۔ آپ کو لائبریری میں کتاب دستیاب ہو جائے گی۔

اِس باغ کا قیام ایک چھوٹے سے باغیچے کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ ۱۷۵۹ء میں جارج سوئم کی والدہ شہزادی آگسٹا نے اِس مقام پر ایک چھوٹا سا باغ بنوایا تھا۔ مغل بادشاہوں کے برعکس، جو محض خوبصورتی اور تفریح کے لیے ہی باغات بنواتے تھے، آگسٹا نے اس کے علمی اور افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ نباتات کی اقسام پر خاص طور پر توجہ دی گئی اور پودوں کے بارے میں نت نئے تجربات بھی کیے گئے۔ بعد کی حکومتوں اور حکمرانوں نے بھی اِس سلسلے کو جاری رکھا۔ انگلستان کے مقامی پودے، پھول اور درخت

معدودے چند ہیں۔ لیکن انگریز سائنس دانوں اور محققین نے دُنیا کے ہر گوشے سے نباتات کے نمونے لاکر یہاں لگائے اور ان پر مفید تجربات بھی کیے۔ اِس اعتبار سے یہ باغ علم نباتات کے طالب علموں کے لیے ایک درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس باغ کی توسیع اور ترقّی کے لیے خود باغ میں اُگائے جانے والے پودوں کی آمدنی سے بھی رقم حاصل کی گئی، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ آج تو "کیو گارڈن" نباتات کے کاروبار کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ پودوں کو بارشوں اور موسموں کے تغیرات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں نہایت اعلیٰ سائنسی انداز میں اہتمام کیا گیا ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیاں بے شمار جدید دواؤں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اور باغ کے منتظمین کو اس سے لاکھوں پونڈز کی آمدنی ہوتی ہے۔

لندن میں آنے والے سیّاح کے لیے اس باغ کو دیکھنا "لازمی ضرورت" ہے۔ اِس طرح سیّاحوں اور باغ میں آنے والے لوگوں کے داخلہ ٹکٹوں سے ہی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے جو ضرورت کے لیے کافی ہے۔

کیو گارڈن کے علاوہ لندن کے مشہور اور خوبصورت باغوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہ باغ اپنی جھیلوں، پھولوں کے تختوں، سبزہ زاروں، درختوں اور سیّاحوں اور بچّوں کی تفریح کے لوازمات کی وجہ سے قابلِ دید ہیں۔ ہر باغ میں صاف ستھرے پُرشکوہ ریسٹوران اور دوسری تفریح گاہیں بھی موجود ہیں۔ لندن کے بعض پارک جو پہلے شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھے، لیکن اب ہر خاص و عام کے لیے کھُلے ہوتے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:۔

سینٹ جیمز پارک، ہائیڈ پارک، کینسنگٹن گارڈنز، کوئین میری گارڈن (یہ ریجنٹ پارک کے اندر ۱۸ ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے) ان باغوں کی رعنائی اور دلفریبی کا کیا پوچھیے۔ یہ باغ تمام سال لوگوں کے لیے کھُلے رہتے ہیں۔ جھیلوں میں کشتی رانی کا بھی اہتمام ہے۔

چیلسی گارڈن : ۱۶۷۳ء میں قائم ہوا تھا۔ پھولوں کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔

بیٹرسی پارک : اِس باغ میں دوسرے پودوں کے علاوہ دُنیا بھر کی مختلف اقسام کے پتھروں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

ہیمپٹن کورٹ گارڈن : اِس باغ کی مخصوص چیز یہ ہے کہ یہاں چھ سو اقسام کے انگور کے درخت موجود ہیں۔

بشی پارک : دریائے ٹیمز کے کنارے پر ہے۔ ایک ہزار ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں سال قدیم بلند و بالا اور خوبصورت قد آور درختوں کے لیے مشہور ہے۔

چِسوک ہاؤس : جھیلوں کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹمپل بھی بنے ہوتے ہیں۔

سیون ہاؤس : درختوں اور پودوں کی بے شمار اقسام کے علاوہ سبزہ زاروں اور خوبصورتی میں بھی لاجواب ہے۔ بہت وسیع و عریض پارک ہے

آسٹرلی پارک : اِس باغ میں تین حسین جھیلیں اور مصنوعی جزیرے بھی ہیں۔

کین وُڈ ہاؤس : جھیلوں، درختوں اور پھولوں کے لیے مشہور ہے۔

گرینے وچ پارک : نباتات کے ذخیرے کے لیے مشہور ہے۔ حسن و رعنائی میں بھی بے مثال ہے۔

مذکورہ بالا باغوں کے علاوہ لندن میں جگہ جگہ کھُلے سبزہ زار اور باغ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنجان آبادی کے باوجود اِس شہر میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگوں کو تازہ ہوا اور آکسیجن کی بڑی مقدار بھی حاصل رہتی ہے۔ بچّوں کو کھیلنے کے لیے میدان

مل جاتے ہیں۔ اور بڑے . . . . یوں تو ہر موسم میں باغوں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں، مگر موسم گرما میں اگر قسمت سے دُھوپ نکل آئے تو یہاں کے لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں عورتیں، مرد اور بچے اوندھے سیدھے لیٹے دھوپ سینکتے نظر آتے ہیں جو ان کے مکانوں اور فلیٹوں میں انھیں حاصل نہیں ہوسکتی۔

فٹ بال یا وبال

فٹ بال انگریزوں کا قومی کھیل ہے۔ لوگ دیوانگی کی حد تک فٹ بال کے شیدائی ہیں۔ سارے ملک میں ۹۱ کے لگ بھگ فٹ بال کلب ہیں جو لاکھوں پونڈز کماتے اور خرچ کرتے ہیں۔ اچھے کھلاڑیوں کے معاوضے (محض ایک سیزن میں) لاکھوں پونڈ تک پہنچ جاتے ہیں۔ فٹ بال یہاں محض ایک کھیل ہی نہیں بہت بڑا کاروبار بھی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کی روزی کسی نہ کسی طرح اس کھیل سے وابستہ ہے۔ فٹ بال کلب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے ہیں۔ فٹ بال کے میچوں پر باقاعدہ سٹّہ بازی ہوتی ہے اور لاکھوں کروڑوں پونڈز کی ہار جیت ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ غیر قانونی نہیں ہے۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے قوانین بنائے ہوتے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق حکومت فٹ بال کے میچوں پر لگائی جانے والی شرطوں پر ہر سال دو سو ملین پونڈز بطور ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس ٹیکس کی رقم سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ "فٹ بال" کا کاروبار اس ملک میں کتنے وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ فٹ بال کا سیزن یہاں سردیوں میں ہوتا ہے۔ موسم گرما میں کرکٹ کا سیزن شروع ہو جاتا ہے۔ کرکٹ بھی کاروبار ہے مگر فٹ بال والی بات نہیں ہے۔

مگر اب چند سال سے متعلقہ حکام فٹ بال کلبوں کے منتظمین قانون نافذ کرنے والے ادارے اور خود عوام بھی سخت پریشانی سے دوچار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فٹ بال کے

میچوں میں ہزاروں لاکھوں تماشائی شریک ہوتے ہیں۔ مگر شاید ہی کوئی میچ ایسا ہوتا ہو جس میں ہنگامہ آرائی، مار پیٹ اور فساد نہ ہوتا ہو۔ چھوٹے موٹے ہنگامے تو خیر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چند درجن تماشائی زخمی ہوتے، دو چار درجن پولیس والوں کو چوٹیں آئیں، لوگوں نے میدان میں توڑ پھوڑ کی۔ بوتلیں اور بیئر کے ڈبے پھینکے اور گھر چلے گئے۔ یہ تو معمول میں داخل ہے اور اس پر کوئی زیادہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھاتا۔ مگر تشویش کی بات یہ ہے کہ اب فٹ بال میچوں میں بہت بڑے پیمانے پر مار دھاڑ شروع ہو گئی ہے۔ یہ میچ مختلف شہروں اور مختلف کلبوں کی ٹیموں کے مابین کھیلے جاتے ہیں۔ ہر ٹیم کے حامی ہزاروں کی تعداد میں گراؤنڈ میں موجود ہوتے ہیں۔ ہارنے والے جیتنے والی ٹیم پر ہوٹنگ کرتے ہیں اور پھر ہارنے اور جیتنے والی ٹیموں کے مدّاحوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ ایسے موقعوں کے لیے پورے "مسلّح" ہو کر جاتے ہیں۔ بوتلیں، ڈبے، پھل، جوتے تو معمولی بات ہے۔ پلاسٹک کی کرسیاں توڑ توڑ کر انھیں میزائلوں کے طور پر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ بے شمار لوگ شدید زخمی ہوتے ہیں۔ میدان میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ سینکڑوں بچے، بوڑھے، عورتیں اور کمزور لوگ اس میں پس کر رہ جاتے ہیں اور بہت سے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ اب تو یہ بھی ہونے لگا ہے کہ اس مار پیٹ اور جنگ و جدل سے دل نہیں بھرتا اور اسٹیڈیم کو توڑ پھوڑ اور نذر آتش کرنے کی کوششوں پر پولیس کسی حد تک قابو پالیتی ہے تو یہ گروہ میدان سے باہر نکل کر دکانوں، بازاروں اور گھروں کا رُخ کرتا ہے۔ یہ ایک سیلاب بلا کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ راستے میں پارک کی ہوئی کاروں کو برباد کر دیتے ہیں۔ دُکانوں اور پٹرول پمپوں کو جلا دیتے ہیں۔ بازاروں میں تباہی مچا دیتے ہیں۔ جدھر سے گزرتے ہیں چنگیز و ہلاکو کی فوجوں کی طرح تباہی اور بربادی کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ قیامت تو تماشائیوں اور شہر کے لوگوں پر گزرتی ہے۔ مگر کھلاڑی بھی ان لوگوں کے غیض و غضب سے محفوظ نہیں رہتے۔ جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑیوں پر ہارنے والی ٹیم کے ہمدرد آفت بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں اور پولیس کی کوششوں کے باوجود بعض کھلاڑیوں کو جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں جب فٹ بال میچوں میں یہ ہولناک ہنگامے عام ہو گئے تو ایک کلب کے مینجر صاحب نے یہ ترکیب نکالی کہ تماشائیوں کو میدان میں داخل ہونے سے روکنے کی غرض سے لوہے کے جنگلے بنا کر ان میں برقی رو چھوڑ دی۔ ان کے اس اقدام کی مخالفت اور حمایت میں بہت شور مچا۔ کھیلوں کے وزیر نے کہا کہ اس طرح تماشائیوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ فٹ بال کلب کے مینجر نے کہا کہ وزیر صاحب تو اناڑی ہیں۔ دفتر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ انھیں فٹ بال کے منتظمین کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ شہر کے میئر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی مگر فٹ بال کلبوں کے منتظمین اس کی افادیت کے قائل تھے۔ مگر عین وقت پر ایک عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا اور اب یہ کام ادھورا ہی پڑا ہوا ہے۔

فٹ بال کلب والے کہتے ہیں کہ عام لوگوں کی جانوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ یہ ہڑبونگ مچانے والے پلاسٹک سیٹیں توڑ دیتے ہیں۔ زنجیر کو چاقوؤں سے کاٹ دیتے ہیں۔ جو چیز سامنے نظر آئے اسے ملیامیٹ کر دیتے ہیں اور اکثر اوقات عمارت میں آگ بھی لگا دیتے ہیں۔ بعض کلبوں میں لکڑی کی سیٹیں ہیں۔ انھیں آگ کی نذر کرنا آسان ہے۔ چنانچہ آتش زدگی کی وارداتیں عام ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس جگہ فٹ بال کا میچ کھیلا جانا ہے وہاں میدانِ جنگ کا نقشہ ہوتا ہے۔ سینکڑوں پولیس والے کیل کانٹے سے لیس کمر بستہ کھڑے ہیں (ان کیل کانٹوں میں محض دفاعی اشیاء ہوتی ہیں) فساد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زرہ بکتر اور آہنی ٹوپیوں میں ملبوس پولیس "جنگ" کے

لیے تیار کھڑی ہے۔ آگ بجھانے والے منتظر ہیں۔ فوری طبی امداد فراہم کرنے کے لیے ایمبولینس کاریں تیار ہیں۔ ہسپتالوں کا عملہ بھی مستعد ہے کہ نہ جانے میچ کے خاتمے پر کتنے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنی ہو گی۔ دکاندار اور شہری الگ سانس روکے بیٹھے ہیں کہ نہ جانے کب ہجوم کا مزاج برہم ہو جائے اور وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ سب دعائیں کر رہے ہیں کہ خدا کرے یہ مرحلہ خیریت سے گزر جائے۔ اور یہ سب ہو کس لیے رہا ہے؟ اس لیے کہ شہر میں ایک فٹ بال میچ کھیلا جا رہا ہے۔ بھلا بتائیے کھیل نہ ہوا ایک آفت ہو گئی۔

ابھی حکّام ان بڑھتے ہوئے ہنگاموں سے اور تباہیوں سے محفوظ رہنے کے طریقے سوچ ہی رہے تھے کہ مئی کے دوسرے ہفتے میں ایک ایسا المناک واقعہ ہوا جس نے اگلے پچھلے تمام ہنگاموں اور فسادات کو ماند کر دیا۔ ہوا یہ کہ بریڈفورڈ شہر میں شہر کی فتح مند فٹ بال ٹیم اور دوسرے شہر کی ٹیم کے مابین میچ کھیلا جانے والا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں دونوں ٹیموں کے مدّاح میدان میں موجود تھے۔ لیکن فتح کا یہ جشن موت اور بربادی کے ہنگامے میں تبدیل ہو گیا۔ اچانک سٹینڈز میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں نے ساری عمارت کو لپیٹ میں لے لیا۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے بھاگے۔ جلتی ہوئی عمارتیں تماشائیوں پر گرنے لگیں۔ دیواروں کے نیچے دب کر بہت سے لوگ مر گئے۔ ایک قیامت کا سماں تھا۔ گھنٹوں آگ بجھانے والے اپنے کام میں مصروف رہے تب کہیں جا کر اس پر قابو پایا گیا۔

مشکل یہ تھی کہ سیٹیں لکڑی کی تھیں اور آتشبازی کی طرح جل رہی تھیں۔ ۵۲ کے قریب افراد جن میں بچے، بوڑھے، جوان سبھی شامل ہیں اب تک مرنے والوں میں گنے جا چکے ہیں۔ پہلے تو مرنے والوں کی شناخت ہی مشکل تھی مگر ایک ہفتے کی محنت کے بعد حکام نے ان کے ناموں اور پتوں کا کھوج لگا لیا۔ دو تین درجن کے لگ بھگ

لوگ لاپتہ ہیں ۔ مرنے والوں میں پورے پورے خاندان بھی شامل ہیں ۔ ایک شخص
اس کے نوجوان بیٹے اور ایک کمسن پوتا موت کی نذر ہو گئے ۔ کلب ملبے کا ڈھیر بن چکا
ہے مگر جلی ہوئی دیوار کے سامنے رشتے دار دوست اور سوگوار پھولوں کے گلدستے لا کر
رکھتے ہیں ۔ ہسپتال زخمیوں سے اٹ گئے ہیں ۔ شہر سوگوار اور ویران ہو گیا ۔ بلکہ سارے
ملک میں سوگ منایا گیا ۔ مقامی حکام نے متاثرین کی امداد اور علاج کے لیے دو کروڑ
پونڈز جمع کرنے کی مہم شروع کی ہے ۔ حکومت نے بھی خطیر رقم دی ہے ۔ وزیراعظم
مسز تھیچر، ملکہ اور دوسرے لوگوں نے اسے قومی سانحہ قرار دیا ہے ۔ تحقیق کیلئے ہائیکورٹ
کے ایک جج کو مقرر کیا گیا ہے ۔ پہلے خیال یہ تھا کہ کسی نے آتشیں بم پھینک کر آگ لگائی
ہے ۔ اب کوئی کہتا ہے کہ ایک شرابی نے جلتی ہوئی سگریٹ سٹینڈ کے نیچے پھینک دی
اور پرانی لکڑی کے سٹینڈ نے فوراً آگ پکڑ لی ۔ لاکھوں پونڈز چندہ جمع ہو چکا ہے ۔ اسکول
کے بچوں نے اپنا جیب خرچ تک چندے میں دے دیا ہے ۔ دوسرے کلبوں کی عمارتوں
کے بارے میں احتیاط شروع ہو گئی ہے ۔ ویمبلے میں جو میچ ہونے والا تھا اس کے لیے خاص
اہتمام کیا جا رہا ہے ۔ کلب والے کہتے ہیں کہ پرانی عمارتوں اور لکڑی کے اسٹینڈز کو بدلنے
کے لیے کروڑوں پونڈ کی ضرورت ہے ۔ لیکن بھاری رقمیں یا تو مشہور کھلاڑی (اسٹار) لے
جاتے ہیں یا پھر حکومت ٹیکسوں میں سمیٹ لیتی ہے ۔ کلبوں کے پاس میدانوں اور عمارتوں
کی مرمت اور اصلاح کے لیے کچھ نہیں بچتا ۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زخمیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے جسم ، ہاتھ
پیر یا چہرے جھلس گئے ہیں اور انھیں کافی عرصہ ہسپتال میں رہنا ہو گا اور ہر شخص کو کئی
کئی آپریشن کرانے ہوں گے ۔ پہلے ہی دن بیس کے لگ بھگ زخمیوں کے آپریشن کیے
گئے ۔ اکثر لوگوں کی پلاسٹک سرجری ہو گی اور انھیں کئی بار تکلیف دہ آپریشن کے مرحلے
سے گزرنا ہو گا ۔ بعض لوگوں کے چہرے شاید کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں اور بہت سے لوگ

زندگی بھر مسخ شدہ چہرے یا ہاتھ پیروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے ۔
بریڈ فورڈ کے اس حادثے سے چند روز پہلے برمنگھم میں بھی ایک میچ کے موقع پر
خاصی ہنگامہ آرائی اور تباہی ہوئی تھی ۔ فریق ٹیموں کے حامیوں نے وہ ادھم مچایا کہ
گھوڑسوار پولیس اور بکتر بند پولیس بلوانی پڑی اور درجنوں پولیس والوں کے علاوہ
بے شمار تماشائی بھی زخمی ہوئے ۔ ایک اور جگہ تماشائیوں کے ریلے سے عمارت کی دیوار
ٹوٹ گئی اور کھلاڑیوں اور منتظمین کی درجنوں کاریں دیوار گرنے کی وجہ سے ملبے کا ڈھیر
بن گئیں ۔

بہرحال ، جیسا کہ آپ جان گئے ہوں گے فٹ بال کے تماشائیوں کا مسئلہ اب حکومت
اور متعلقہ کلبوں کے اختیار سے باہر ہو رہا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس مشکل کا حل
کیا ہے ؟ خود مارگریٹ تھیچر بھی اس سوال کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہیں ۔ فٹ بال
کلبوں کے منتظمین اور حکام پر مشتمل مشاورتی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں ۔ مگر کیا اس طرح اس
روگ کا علاج تلاش کیا جا سکے گا ؟ کسی کو اس سوال کا تسلی بخش حل نظر نہیں آ رہا ۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس غنڈہ گردی اور ہنگامہ آرائی کا سبب کیا ہے ؟
اسباب تو بہت سے اور مختلف ہیں ۔ مثلاً لوگوں کا بدلتا ہوا رویہ ، ان میں تشدد پسندی کا
رجحان بڑھ رہا ہے ۔ انگلستان جس پر انگریز فخر کیا کرتے تھے اب وہ انگلستان نہیں
رہا ۔ لوگوں میں قانون شکنی کا رجحان بڑھ گیا ہے ۔ معمولی باتوں پر توڑ پھوڑ اور فسادات
روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں ۔ لیکن ایک بات پر سبھی متفق ہیں اور وہ یہ کہ اس دکھ
کا سب سے بڑا سبب شراب خانہ خراب ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ تماشائی شراب کے نشے
میں دھت ہو کر ساتھ میں شراب کی بوتلیں اور ڈبے لے کر میدان میں جاتے ہیں ۔
بہک کر جذبات اور جوش میں فتح اور شکست کی صورت میں ایک دوسرے پر ٹوٹ
پڑتے ہیں اور پھر انھیں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا ۔ ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں

"ان پر جنون طاری ہو جاتا ہے، انھیں احساس ہی نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟"

گویا بہت بڑا سبب شراب ہے۔ دوسرے اسباب بھی ہیں مگر بنیادی سبب یہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب مہذّب، ترقّی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم کا یہ حال ہے تو پھر ہمارے ملک کے اَن پڑھ اور غیر ترقّی یافتہ لوگ اگر کبھی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس پر شور قیامت برپا کرنا کہاں تک جائز ہے؟ آسٹریلوی کرکٹ ٹیم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس پر قومی اخباروں نے لکھا تھا کہ

"ہمارا سر دوسری قوموں کے سامنے شرم سے جھک گیا ہے۔"

واقعی شرمندگی کی بات بھی تھی لیکن لطف یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر تشویش اور فکر مندی کے جذبات تو نظر آتے ہیں۔ شرمندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

❖

قائداعظمؒ، پاکستان، سیاسیات

انسائیکلوپیڈیا قائداعظمؒ	زاہد حسین انجم
پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں	ڈاکٹر صفدر محمود
ضیاء کے بعد	ہمایوں ادیب
پاکستان سے پاکستان تک	عشرت رحمانی
تاریخ سیاست ملی	عشرت رحمانی
قائداعظمؒ اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری
خطباتِ قائداعظمؒ	رئیس احمد جعفری
آزادیٔ ہند	ابوالکلام آزاد / رئیس احمد جعفری
پاکستان کا اسلامی پس منظر	آغا اشرف
روداد پاکستان	آغا اشرف
مرقعِ قائداعظمؒ	آغا اشرف
حیاتِ جوہر	عشرت رحمانی
معلوماتِ پاکستان	ناصر نقوی
معلوماتِ قائداعظمؒ	یونس ادیب